ینابیع المسیحیت

یا

سرِّ اہمِ حیات

مُصنّفہ

حضرت خواجہ کمال الدّین صاحب مبلّغ اسلام

مُسلم بُک سوسائٹی

عزیز منزل - برانڈرتھ روڈ - لاہور (پاکستان)

وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ

اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح ابن اللہ ہے۔ یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں اپنے سے پہلے کے اہل کفر کی نقل کرتے ہیں

ینابیع المسیحؑ

(یا)

سِراجِ حقیقت

مصنفہ حضرت خواجہ کمال الدین صاحب مبلّغ اسلام

جسمیں یہ دکھایا گیا ہے کہ مسیحیت کی روایات۔ اصطلاحات۔ رسمیات۔ جناب مسیحؑ کی پیدائش
صلیب۔ جی اٹھنا وغیرہ وغیرہ۔ کل کی کل باتیں قدیمی مذاہب باطلہ کی روایات سے مسلمتاً اخذ کی گئی

مسلم بک سوسائٹی۔ عزیز منزل۔ برانڈرتھ روڈ لاہور (پنجاب)

تاریخ طبع

من کلام البرق گنجوی سلمہ القوی

بدست آمد آن شاخِ پُر میوہ — کہ باید حلاوت دل و کام ازو
بفرمود رضوان ز باغِ نعیم — بہجری رقم آر تاریخِ او
بتعمیلِ ارشاد پُر ذوق شب — بفکرات بردم دمے سر فرو
سنِ طبع اے برق "پولوس" گفت — ز قلبِ مَن "اثمارِ شیرین" بگو
١٣٤٢ھ

ولہ

کہتے تھے آہنی ہے قلعہ مسیحیت کا — دیکھا تو وہم ہی تھا دھوکا تھا مادیت کا
اک پھونک سے پتا تھا دیوار کا نہ چھت کا — بالو ہی کا گھروندا نکلا مسیحیوں کا
جب چھپ گیا وہ نسخہ سالِ مسیحی اُس کا — سر کالے کوبرے کا بے شبہ جس نے کچلا
بے چشم زود لکھا "سرچشمہ کلیسا" — اے راہب کنیسا مندر ہے شمسیوں کا

فہرست مضامین

۱ صدائے صوت مکّہ مُکرّمہ ۵

۲ مشاہیر کلیساء انگلستان کے معتقدات جدیدہ ۱۸

۳ اساطیر الاولین مسیحی کلیسا کے ماخذ ۵۹

۴ مسیحی فلسفہ اور کلیسی مصطلحات ۱۱۷

۵ مسیحی کلیسا کے معمار ۱۳۵

۶ اسلام یا مذہب محبّت ۱۴۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ______ نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

پیش لفظ طبع ثانی

حضرت خواجہ کمال الدین رحمۃ اللہ علیہ کی معرکتہ الارا تصنیف ینابیع المسیحیۃ جب ۱۹۲۳ء عیسوی میں شائع ہوئی تو عیسائی دنیا میں تہلکہ مچ گیا اور مسیح کی الوہیت کے صدیوں کے بنائے سجائے ہوئے گروندھوں میں ناقابل مرمت شگاف پڑ گئے اور پڑتے ہی گئے۔ اس کتاب کی افادیت اب بھی اتنی ہی ہے جتنی آج سے سینتالیس سال پہلے تھی اس لئے دوستوں کے اصرار پر اس کی طبع ثانی کرائی گئی ہے۔

طبع ثانی میں گذشتہ کتابت کی غلطیوں کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں جہاں جہاں قرآن کریم کی آیات یا فارسی فقرات کے تراجم نہیں دئے گئے تھے وہاں اب ترجمے حاشیہ پر دے دئے گئے ہیں اور بعض الفاظ جن کو آج کل سمجھنے میں مشکل درپیش آسکتی ہے انکی تشریح کر دی گئی ہے۔

اس کتاب کی طباعت کا تمام خرچ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کی جماعت لائیلپور نے برداشت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

میں محترم ڈاکٹر محمد سلطان نظامی صاحب کا مشکور ہوں جنہوں نے نہ صرف اس کتاب کو طبع کروانے میں میری مدد کی بلکہ بڑی محنت سے پروف بھی پڑھے۔ کتاب کی قیمت تقریباً لاگت کے برابر رکھی گئی ہے۔ تاکہ احباب اسے خرید کر آسانی سے عیسائیوں میں مفت تقسیم کر سکیں۔

احمدیہ بلڈنگس برانڈرتھ روڈ
لاہور

احقر العباد
(چوہدری) فضل حق

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہِ الکریم

صدائے صوت مکّہ مکرّمہ

شان ایزدی! مذہب تو مختلف افراد انسانی میں ایک واسطہ مشترکہ ہو کر محبت و اتحاد پیدا کرنے آیا تھا لیکن بدقسمتی سے وہی نسل انسانی میں باعث نفاق و شقاق ہو گیا۔ انسان مدنی الطبع واقعہ ہوا ہے۔ اُس کا تمدن اُس کی تہذیب باہمی اتفاق و اتحاد پر مبنی ہے۔ قومی مشارکت یا لسانی مجانست اتفاق و اتحاد کی وہ طاقت ہرگز اپنے اندر نہیں رکھتی جو اشتراکِ ملّیہ میں موجود ہوتی ہے ؏

اگر مذہب خدا کی طرف سے تھا، تو ضرور تھا کہ ہر ایک قوم کو ایک ہی شکل میں دیا جاتا، اور کوئی قوم اُس کی برکت سے خالی نہ رہتی، خصوصًا

اُن ایّام میں جب مختلف انسانی طبقوں میں میل جول کا کوئی ذریعہ موجود نہ تھا۔ رب العالمین نے جسمانی پرورش کے لئے نہ تو کسی خاص قوم کی طرفداری کی، نہ کسی سے بخل کیا، جو کچھ ایک قوم کو دیا وہی دنیا کی سب قوموں کو دیا۔ ایسے خداوند کی ربوبیت تامہ اس بات کی ہی مقتضی تھی کہ اُس کی طرف سے وہ مُبارک چیز جس کا نام مذہب ہے ہر ایک انسان کے حصّہ میں یکساں آئے۔ بات تو یہ صاف تھی لیکن دنیا کی مشہور الہامی کتابوں میں سے اگر کسی کتاب نے اس صداقت کو تعلیم کیا تو وہ قرآن کریم ہے مختلف مذاہب کے ماننے والوں میں اخوت و اتفاق پیدا کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کیا تعلیم ہو سکتی تھی۔ کہ دنیا میں ہر قوم کی طرف خدا کے نبی آئے، دُنیا کے سب مذاہب اپنی اصلی ہیئت وصورت میں ایک ہی سرچشمہ سے نکلے۔ اور ایک ہی تعلیم لائے؟ جب اللہ تعالیٰ نے ایک ہی چیز سے نسل انسانی کی جسمانی پرورش کی، تو یہ بھی ضروری تھا کہ روحانی پرورش بھی ایک ہی طریق سے، ایک ہی چیز سے ہو۔ قرآنی تعلیم نے اس معاملے میں دلِ مسلم کو ایسا وسیع کر دیا ہے، کہ وہ کسی کے مذہب کو اُس کی ابتدائی حالت میں انسان کی طرف منسوب نہیں کرتا۔ بلکہ اُسے ربِّ واحد کی طرف سے سمجھ کر اپنے آپ کو اُس کا مطیع قرار دیتا ہے۔ اور اس طرح انسانی فسادات کی پہلی بنیاد کا قلع قمع کر دیتا ہے، ہم سب ایک ہی منبع سے نکلے ہیں،

اور ایک ہی سرچشمہ سے ہمیں زندگی کا پانی پلایا گیا ہے۔ لیکن انسانوں نے اس مصفا اور پاکیزہ پانی کو جو وحی الٰہی کی شکل میں خدا کی طرف سے سب کے لئے یکساں نازل ہوا مختلف آمیزشوں سے گدلا کر دیا۔ جو انسانوں میں فساد اور اختلاف کا باعث ہو گیا اور اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اگر خدا سب کا ہے اور وہ بالضرور سب کا ہے تو یہ حقیقت بدیہی ہے کہ سب کی طرف خدا کا ایک ہی مذہب آنا چاہیئے چنانچہ اسی صداقت کی طرف قرآن کریم ذیل کے الفاظ میں ارشاد فرماتا ہے۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (النحل ۶۳:۶۴)

خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔

"ہمیں اپنی اُلوہیت کی قسم ہم نے تو تجھ (نبی صلعم) سے پہلے ہر قوم کی طرف رسول بھیج دیا۔ لیکن شیطان نے لوگوں کے اعمال کو (جو منشاء الٰہیہ کے مطابق نہ تھے) اُن کی نگاہ میں خوبصورت کر دکھایا آج وہی ان کا ولی ہے اور یہی باتیں اُن کے لئے موجب عذاب ہو گئیں۔

انسانوں میں طرح طرح کے اختلاف پیدا ہو گئے اسی لئے ہم نے یہ کتاب (قرآن شریف) تمہاری طرف بھیجی ہے کہ کھُلے کھُلے دلائل کے ساتھ اِن اختلافات کو مٹا دیا جاوے" اور سب کو اصلی مذہب پر جو قدیم سے ایک ہی تھا اور ایک ہی صورت میں خدا کی طرف سے ہر جگہ آیا جمع کر دیا جائے ؛

یہ کس قدر سچی صداقت ہے کسی قوم یا کسی انسان کو خدا تعالےٰ پر کیا حق حاصل ہے کہ وہ تو خدا سے راستہ پائے اور دوسرے اُس سے محروم رہیں اور اگر وہی حقیقی راہ فلاح و نجات کی ہے تو سب کے لئے ایک ہی ہونی چاہیئے اور قرآن مجید کہتا ہے کہ سب کے لئے ایک ہی ہے لیکن آج یہ مختلف مذاہب میں جو اختلاف عظیم ہے اس کا باعث انسان کے سوا اور کون ہے ؟

یہ امر بھی ناممکن ہے کہ خدا تعالیٰ ایک وقت انسان کو صحیح رستہ بتائے لیکن جب انسان اپنی غلط کاری سے وہ راستہ کھو بیٹھے، یا اُس کی شکل و صورت بدل دے۔ تو وہ ہادی حقیقی خاموش رہے اور انسان کو غلطی پر قائم رہنے دے۔ اسی طرح یہ امر بھی اُس کی شان توحید سے دور نظر آتا ہے۔ کہ وہ پہلے تو ایک راہ ہدایت تجویز کرے۔ پھر ہزاروں برس کے تجربہ کے بعد وہ راہ جب اُسے مفید نظر نہ آئے تو اُس کی جگہ ایک اور راہ

تجویز کرے جیسا کہ کلیسا کی تعلیم ہے یہ تو اُس کے علم ازلی پر ایک بدنما دھبّہ ہے

اِن منطقی قضایا کا جن میں دراصل میں نے کل مذاہب دیگر پہ ایک مختصر سا تبصرہ کر دیا ہے لازمی نتیجہ یہی ہے کہ اگر شارع اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت پر دنیاء مذہب میں اس قدر اختلاف عظیم تھا کہ ایک مذہب دوسرے مذہب سے بالکل برعکس تھا۔ تو ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ خاتم النبیینؐ کے ذریعے ازسرنو مذہب حقہ کو اپنی اصلی حیثیت و شکل میں تعلیم کرے۔ چنانچہ اس برگزیدہ انسانؐ نے سرچشمہ ہدایت سے اُسی مذہب کو پایا جو اُس سے پہلے نوحؑ سے لے کر سیدنا مسیحؑ تک ہر قوم و ملّت کو دیا گیا اُس نے سب سے پہلے اِن قوموں کو مذہب کی طرف دعوت دی جنہیں ایک نہ ایک وقت خدا کی طرف سے کوئی کتاب پہنچ چکی تھی لیکن وہ اس وقت ایک طرف تو کتاب اللہ کو محرف کر چکے تھے دوسری طرف حقیقی راستے سے دور چلے گئے تھے اس لئے اُس نے الفاظ ذیل میں کل اہل کتاب کو حقیقی راہ کی طرف بلایا۔ فرمایا:۔

قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ (آل عمران: ۶۳)

"کہو اے خدا کی کتاب والو ہم کیوں ایک دوسرے سے جھگڑیں
اور تنازعہ کریں، کیوں نہ ایک ایسی بات پر جمع ہو جائیں
جو ہم سب میں مشترک اور متحد ہے ہم خدا کے سوا کسی کی
فرمانبرداری نہ کریں اس کے ساتھ کوئی شریک ہی نہ ٹھہرائیں
اور اس کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائیں ؎"

اللہ! اللہ! کس قدر سیدھی صاف اور بے نفسانہ تعلیم ہے اور غور کرو تو کل فلسفہ زندگی کا نچوڑ ہے۔ آنحضرت صلعم یہ تو نہیں کہتے کہ جو میں کہتا ہوں سنو یا میرا تجویز کردہ مذہب قبول کرو۔ خدا کی فرمانبرداری کی تعلیم دیتے ہیں۔ کیا علوم جدیدہ ہماری معاشرت اور ہمارے تمدّن نے اس مذہب کی تصدیق نہیں کی ——— اسی مذہب کا نام **اسلام** ہے یعنی خدا تعالےٰ کے قوانین پر چلنا۔ جسمانیات میں سائنس نے ہمیں اُن قوانین کا پتہ دیا جو خدا تعالیٰ نے نظام عالم کے چلانے کے لئے بنائے ہم مجبوراً اُن قوانین پر چلتے ہیں ان قوانین پر چلنے کا نام **اسلام** ہے۔ اس موضوع پر میں آگے چل کر کچھ لکھوں گا خلاصتہً یہاں اسی قدر کہتا ہوں کہ کائنات کی ہر ایک چیز اور اُس میں انسان بھی شامل ہے۔ اپنے نشو و نما پانے کے لئے اور اپنے جوہر مضمرہ کو کمال تک پہنچانے کے لئے مقررہ اور لاتبدیل قوانین کی اطاعت

پر مجبور رہے۔ سائنس نے اپنی ہر شاخ میں اسی امر پہ مہر صداقت ثبت کی ہے۔ ہر شعبۂ زندگی میں انسان کا یہی مذہب ہے۔ جسمانیات میں یا ذہنیات میں اگر ان قوانین کو انسانی مشاہدے اور تجربے نے دریافت کر لیا ہے تو اخلاقیات اور روحانیات میں الہام آلٰہی نے قوانین الٰہیہ کی طرف انسان کی راہنمائی کی ان قوانین پر چلنے کا نام خواہ جسمانیات میں ہو یا روحانیات میں ———— عربی زبان نے **اسلام** تجویز کیا ہے۔ کیا ہم اس طریق سے انحراف کر سکتے ہیں۔ ہمارا ان معنوں میں اسلام سے منحرف ہونا تباہی اور ہلاکت کو خریدتا ہے اس حقیقت کو کیسے سیدھے اور صاف الفاظ میں قرآن مجید نے چند آیات کے ذریعے بیان کر دیا :-

"اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ○
(آل عمران: ۸۲)
"اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ" وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ج وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ (آل عمران : ۸۴)

"خدا کی راہ (قوانین آلٰہیہ) کو چھوڑ کے یہ کس دین کی تلاش میں ہیں دیکھتے نہیں کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے ۔ وہ

طوعاً و کرہاً اُس کے قوانین کی اطاعت کر رہے ہیں خدا کا
دین تو **اسلام** (اطاعت قوانین آلہیہ) ہے پھر جو چاہے
اسلام (اطاعت قوانین آلہیہ) کو چھوڑ کے دیکھ لے اُس
کا یہ فعل مقبول نہ ہو گا وہ نقصان اُٹھائے گا"۔

کوئی ہے جو اس صداقت سے عملاً انکار کرے اور آن واحد میں اُس کی زندگی کا خاتمہ نہ ہو۔ یہی مذہب یہی بات خدا کے کل نبیوں نے تلقین کی۔ **لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ** کی یہی حقیقت ہے۔ اہل کتاب کو اسی حقیقت کی طرف بلایا گیا ہے:۔

تیرہ سو برس ہوئے جب یہ آواز **وادیٔ فاران** سے آئی اس صلائے عامہ کے جواب میں لکھو کھا نہیں کروڑوں اہل کتاب نے لبیک کہا وہ داخل اسلام ہوئے۔ اس طرح اسلام نے آہستہ آہستہ ایک عالمگیر اخوت پیدا کر کے ایک بڑے حصہ دنیا کو فساد و نزاع سے بچا لیا۔ مشرق میں بہت جلد یہ سیدھا سادہ اور مختلف پیچیدگیوں سے پاک مذہب قائم ہو گیا لیکن مغرب تک یہ باتیں نہ پہنچ سکیں۔ آج مغرب و مشرق کا باہمی تباین اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ اس سے دنیا کے امن میں سخت خلل واقعہ ہو رہا ہے۔ اس نفاق و شقاق کا موجب بہت سے سیاسی امور بتلائے جاتے ہیں لیکن واقعات حاضرہ نے اس امر

کو ثابت کر دیا ہے کہ دراصل ان سب کی تہ میں مذہبی اختلاف ہے اگر ملّی تنازعات ختم ہوجائیں تو باقی وجود اختلاف کا کسی صحیح مفاہمہ کے ذریعے فیصلہ پا لینا کوئی امر مشکل نہیں آئرلینڈ کے فساد اس کی بہترین مثال ہیں۔ اختلاف مذہب نے ہی اس ملک کو تباہ کر رکھا ہے۔ دوسری طرف بلگیریا۔ سرویہ۔ مانٹینگرو۔ یونان آج کل کے نئے پیدا شدہ ذیقوسلاف۔ یہ سب کے سب مختلف قومیں ہیں تمدن۔ اخلاق تہذیب میں ایک دوسرے سے جُدا ہیں امور تہذیب و تمدن میں اُن میں سے بعض کا درجہ نہایت ہی ادنیٰ ہے۔ بالمقابل ترکوں کی تہذیب اُن کی انسانیت اُن کی شرافت اخلاق کو آج سے بیسیوں سال پہلے یورپ کے بہترین عمائد نے تسلیم کیا تو پھر کیا وجہ ہے، کہ سرویا کے وحشی۔ ظالم یونانی اور بلغاری تو حقوق مساوات حاصل کریں اور ترکوں کے مطالبات پر تنازعہ ہو میکسیکو جیسی ناتراشیدہ حکومت کو تو اپنی عدالت میں دیگر اقوام مغرب کے مقدمات کی سماعت کا حق حاصل ہو لیکن ترکوں سے مطالبہ ہوتا ہے کہ غیر ترکی لوگوں کے مقدمات اُن کی سماعت میں نہ آئیں اس سارے معاملے کی تہ میں اگر مذہب نہیں تو اور کیا شے ہے۔

جنگ عظیم[1] تو ختم ہو گئی لیکن کون نہیں جانتا اس وقت بھی دنیا کے مختلف حصص میں وہ چنگاریاں سلگ رہی ہیں جو دنیا میں کسی دن آتش عظیم

[1] پہلی جنگ عظیم

پیدا کر دیں گی دنیا جنگ سے تنگ آ گئی ہے لیکن جنگ نسل انسانی کو نہ چھوڑے گی ہاں جنگ بہت حد تک رک سکتی ہے۔ اگر اسلام اور عیسائیت میں ایک قسم کا برادرانہ مفاہمہ ہو جائے، اور اسلام میں ایسے مفاہمے کے لئے بہت کچھ مواد موجود ہے۔ ہم سیدنا مسیحؑ کو خدا کا ایک اولوالعزم نبی اور واجب العزت رسول مانتے ہیں۔ قرآن انہیں وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ - كلمة الله - روح الله کہتا ہے ہم بلحاظ منصب نبوت آپ میں اور اپنے نبی صلعم میں کوئی فرق نہیں کرتے اور کس طرح کریں جب خدا تعالےٰ کا ہمیں حکم ہے

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ (آل عمران - ۸۳)

"کہو ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر ایمان لائے جو ہم پر اور ابراہیمؑ۔ اسمٰعیلؑ۔ اسحاقؑ۔ یعقوبؑ اور اس کی اولاد پر نازل ہوا اور ہم اس پر بھی ایمان لائے جو موسیٰؑ۔ عیسیٰؑ اور رب کے دوسرے نبیوں کو دیا گیا ہم ان میں فرق نہیں کرتے۔ ہم خدا کے تابع ہیں

اس حکم کے بعد ہم مسلمان نہیں رہ سکتے اگر ہم سیّدنا محمدؐ اور سیّدنا مسیحؑ میں کوئی تمیز کریں۔ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ ہم اپنی محبت مسیح علیہ السلام میں نصرانیوں سے کسی صورت میں کم نہیں ہیں۔ جس وقت ہم آنحضرت صلعم پر درود و سلام بھیجتے ہیں ہم جناب مسیحؑ کو اور دیگر انبیاء کو بھی شامل کر لیتے ہیں بلکہ سچ پوچھو تو ہم ہی جناب مسیحؑ سے حقیقی محبت اور اخلاص رکھتے ہیں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ مسیحؑ خدا نہ تھے اور آج تو عیسائی دنیا بھی یہ ماننے کو تیار ہو گئی ہے۔ تو بہت سا جھگڑا طے ہو جاتا ہے۔ کیا اُس پاک وجود کو الوہیت کے ساتھ متصف کرنا یا انہیں مدعی الوہیت ٹھہرانا ایک قسم کا بہتان نہیں۔ درحقیقت یہ کوئی محبت نہیں۔ اصل محبت یہی ہے کہ ہم اپنے محبوب کو اُس کی اصلی حیثیت میں دیکھیں۔ مثلاً ایک شخص کو جو بادشاہ کا بیٹا نہیں اُسے ایسا کہنا محبت کا نشان نہیں! یہ تو دراصل اُس کی ذات پر ایک حملہ ہے ؏

فی الجملہ ایک طرف عیسائی اور ایک طرف ہم۔ جب دونوں گروہ سیّدنا مسیحؑ سے محبت رکھتے ہیں۔ دونوں کی محبت کا نصب العین ایک ہی ہے، تو پھر کیوں ہم میں فساد ہو۔ کل تنازعات تو اُن کی ذات کے متعلق ہیں۔ کیوں نہ آشتی اور محبت سے اپنے محبوب کی اصلی حیثیت کو متحقق کر لیا جائے۔ اگر عیسائی احباب سے ہمارا کوئی تنازعہ ہے

تو صرف اس لئے کہ بہت سی ایسی قدیمی روایات جن کا تعلق پرانے کفر والحاد سے تھا۔ اور جو مسیحؑ سے ہزاروں برس پہلے ایران۔ یونان۔ بابل۔ نینوا۔ کارتھیج۔ سیریا۔ مصر۔ روما۔ میکسیکو کی قصہ کہانیوں میں دائر وسائر تھیں وہ ہمارے پیارے مسیحؑ کے نام منسوب کردی گئی ہیں۔ کیا ہمیں رنج پیدا نہ ہو کہ جو باتیں دنیا کے قدیمی ملحدوں نے سورج دیوتا یا دوسرے معبودوں کے متعلق بطور عقاید مذہب میں داخل کر رکھی تھیں وہ مسیحؑ کے مبارک مذہب میں آ داخل ہوئیں مسیحؑ کا مذہب تو اسلام تھا لیکن اُس کی پاک ہستی بدقسمتی سے مذہب شمسی کا معبود بن گئی۔ میری اس کتاب کا موضوع دراصل یہی ہے جس پر آیندہ صفحات میں روشنی ڈالیں گے۔ لیکن یہاں میں پھر یہ تکرار کہتا ہوں کہ عیسائیوں سے ہمارا اختلاف محض محبّت اور اخلاص کی بنا پر ہے۔ مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ ہم ایک ہی باپ کے بیٹے ہیں اور ہم دنیا میں اپنے باپ کی عزّت و تکریم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہم میں کچھ اختلاف سا پیدا ہو گیا ہے۔ مسیحؑ کے بعض بیٹے (عیسائی) جن وجوہ سے باپ کی تعظیم و تکریم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ باتیں اُس کے دوسرے بیٹوں (مسلمانوں) کے نزدیک باپ کے مزیلِ شان ہیں۔ بس یہی حقیقت تنازعہ ہے۔ اس رواداری کے زمانہ میں جب انسانی اخلاق اس قدر سلجھ چکے ہیں کہ ہم

ایک دوسرے کی مخالف سے مخالف باتوں کو حوصلہ اور صبر سے سن سکتے ہیں اور اُن پر غور کر سکتے ہیں، تو پھر کیوں ہم اس امر متنازعہ کو فراخ دلی کے ساتھ تہ نہ کر لیں ؛

اِن چند باتوں نے مجھے ان اوراق کے لکھنے پر آمادہ کیا۔ میں اس وقت مکّہ مکرّمہ میں بیت اللہ کے سامنے بیٹھا ہوں جہاں سے تیرہ سو برس ہوئے " یَآ اَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ الخ .... کی ندا اُٹھی اور نہایت ہی مبارک ثابت ہوئی۔ میں آج اپنی آواز کو اُسی مقدس آواز کی ایک صدائے بازگشت سمجھتا ہوں۔ یہ ایک صلح اور آشتی کی ندا ہے جو ایک مسلم دل سے نکلی ہے اور ربّ کعبہ سے جس کے گھر کے سامنے بیٹھ کر میں نے یہ کتاب لکھوانی شروع کی ہے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس صدائے صوت مکّہ کو مثمر ثابت کرے۔ آمین۔ ثم آمین ؛

میں یہاں حاجی ارباب احمد علی خاں صاحب سب جج پشاور کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں جن سے میں نے یہ کتاب املا کرائی۔ میری صحت ابھی اس قابل نہیں ہوئی کہ میں اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ سکوں۔ احباب میرے لئے دعا فرمائیں ؛

مکّہ مکرّمہ ۵۔ ذی الحجہ ۱۳۴۲ھ
مطابق ۱۹۔ جولائی ۱۹۲۳ء

خواجہ کمال الدین

مشاہیر کلیسا

انگلستان کے معتقدات جدیدہ

جب سے میں انگلستان میں تبلیغ اسلام کے لئے گیا، تب سے مجھے اس بات کی ہمیشہ تلاش رہی، کہ مذہب کلیساء اور اُس کے اصول جو مسیحؑ کے نام پر آج دنیا میں پیش کئے جاتے ہیں، وہ کہاں سے لے کر مسیحی مذہب میں شامل کر دیئے گئے۔ مسیحؑ کی تعلیم کا جو نقشہ قرآن شریف پیش کرتا ہے اناجیل اربع بھی قریب قریب جس کی مصدق ہیں ۔ وہ تو اسلام کی ایک شکل ہے، لیکن مختصراً کلیسا کی یہ داستان ہے۔ کہ نسل انسانی فطرۃً گنہگار تھی جس کے باعث وہ ہلاکت میں تھی۔ اس ہلاکت سے خدا بچانا چاہتا تھا۔ لیکن گناہ کی پاداش بھی ضروری تھی۔ آخر خدا نے یہی پسند کیا کہ گناہ کی سزا وہ خود بھگتے۔ اس لئے اُس نے کنواری کے پیٹ سے جنم لیا۔ انسانی صورت میں صلیب پر چڑھا۔ دنیا کی لعنت کو اپنے پر لیا۔ سزا کی لمبی

پوری کرنے کے لئے دو دن دوزخ میں رہا۔ اس طرح کفارۂ گناہ کو پورا کرکے پھر زندہ ہوا۔ اب جو شخص اس داستان پر ایمان لائے خواہ عمل کرے یا نہ کرے وہ نجات پالے گا۔ پھر مسیحؑ کے کسی واقع کی یاد میں عشاء ربانی ہوتی ہے اُس میں جو شریک ہو جونہی اُس کے حلق سے مقدس روٹی کا ایک ٹکڑا اور شراب کا قطرہ اُتر جائے تو اُس کے جسم میں مسیحی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ہے خلاصہ مسیحی مذہب کا ؛

یہ باتیں تو ہندوستان کے کئی مشرک فرقوں میں جستہ جستہ نظر آتی ہیں مسیحؑ جیسے مواحد انسان کی تعلیم میں کیسے آداخل ہوئیں ؟ ان کی جھلک پولوس کی تعلیم میں ضرور ہے لیکن اُس کی تعلیم کا ماخذ کیا ہے ؟ میری حیرت اور بھی بڑھ گئی جب میں نے گذشتہ پانچ چھ سال میں مشاہیر کلیسا کو آہستہ آہستہ اُن باتوں کی مخالفت پر، اور اُن کو چھوڑتے دیکھا۔ خصوصًا اگر گذشتہ چھ سات سال کی اُن حرکات پر توجہ کی جائے، اور اُن افعال و اقوال کو بنظر غور دیکھا جائے جو کلیسا کی چوٹی کے آدمیوں سے سرزد ہوئے تو ایک انسان آسانی سے اس نتیجے پر آسکتا ہے۔ کہ یہ واجب الاحترام بزرگ بھی سمجھ چکے ہیں کہ مروجہ تعلیماتِ کلیسا کو مسیحؑ سے کوئی تعلق نہیں اور ان کے خیال میں خواہ وہ غیر صحیح ہی کیوں نہ ہو کلیسا کو چھوڑنا یا اُس کا توڑنا بہت سی سیاسی اور ملکی مصلحتوں کے لئے ضرر رساں ہوگا۔ دل کے بھید تو خدا ہی

جانتا ہے لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے۔کہ یہ بزرگ کلیسا کو قائم رکھ کر اس کو کل متداثرہ تعلیم سے پاک کر دینا چاہتے ہیں۔یا بالفاظ دیگر یہ مشاہیر ملک کو عیسائی بھی دیکھنا چاہتے ہیں، اور ہر ایک ایسی تعلیم کو جو صدیوں سے جناب مسیحؑ کے نام پر دی جا رہی ہے اُس کو لوگوں کے دل سے نکال کر اُس کی جگہ کوئی نئی تعلیم اب ڈالنا چاہتے ہیں۔ وہ تعلیم تو یقیناً تعلیم اسلام ہی ہوگی، لیکن وہ مسلمان کہلانا نہیں چاہتے۔ لیکن مذہب کا بنانا خدا کا فعل ہے اور بیت عنکبوت ٹوٹ کر رہے گا؛

اِن باتوں نے مجھے اور بھی اس امر کی تلاش میں لگا دیا کہ یہ مواد جو اس وقت مشاہیر کلیسا کے نشتر تلے آچکا ہے، کہاں سے کس وقت اور کیوں جسم نصرانیت میں آداخل ہوا۔خدا کا احسان ہے کہ میری تحقیق ٹھکانے لگی اور قیام مکہ معظمہ کی برکت میرے لئے بہت سے انکشافات کا موجب ہوگئی۔ لیکن میں اپنی تحقیق کے نتائج لکھنے سے پہلے ان اوراق کے پڑھنے والوں کو کلیسی مشاہیر کے موجودہ خیالات اور معتقدات سے اطلاع دینا چاہتا ہوں؛

ابھی یورپ میں جنگ شروع نہ ہوئی تھی کہ بعض مسیحی علما مروجہ تعلیم کلیسا سے غیر مطمئن ہو گئے۔ انہوں نے اس موضوع پر کتابیں بھی لکھیں۔ دیگر مسیحی علماء کو مخاطب کیا کہ وہ کلیسی تعلیم کی اصلاح کریں۔ اُن میں سے

ایک مشہور فاضل جرمنی کے ڈاکٹر **یوفن** تھے۔ اُن کی تصنیف نے جو ۱۹۱۳ء میں نکلی طبقہ علماء میں ایک ہلچل ڈال دی انہوں نے علی الاعلان یہ لکھا کہ عیسائی کلیسا کے حالات اندرونی سخت اصلاح طلب ہیں۔ اگر کلیسا کی تعلیم کو درست نہ کیا گیا تو مسیحیت کو سخت نقصان پہنچے گا۔ یہ کتاب اس وقت میرے لئے حیرت افزا واقع ہوئی میں حیران تھا کہ وہ کونسی باتیں مسیحی مذہب میں ہیں جو ڈاکٹر موصوف کے نزدیک چھوڑنے کے قابل ہیں۔ اس پر چند ماہ گذرے تھے کہ مجھے پیرس میں ایک مذہبی کانفرنس کی شمولیت کے لئے بلایا گیا۔ علمائے مغرب کا وہ ایک ممتاز جلسہ تھا۔ قریباً کل کے کل آلہیات کے ڈاکٹر اور فاضل وہاں جمع تھے وہ سب کے سب مروجہ مسیحی تعلیم سے بیزار ہو کر کسی صحیح مذہب کی تلاش میں لگے ہوئے تھے۔ میرا انہوں نے خیر مقدم کیا۔ میری تجویزوں کو توجہ سے سُنا۔ ہم نے ایک لمبی سکیم اپنے سامنے رکھی لیکن جنگِ عظیم نے پیدا ہو کر یہ سب کی سب باتیں برطرف کر دیں۔

اس جنگ نے دنیا کی کل اقوام و ملل کو میدان حرب میں لا جمع کیا۔ جنگ میں شریک ہونے والوں نے میدان جنگ میں دیکھا کہ جن مسلمانوں کو وہ بیگن (کافر و ملحد) سمجھتے تھے وہ عیسائیوں

سے کہیں زیادہ خدا پرست تھے جہاں عیسائی سپاہی میدان جنگ کے
خالی اوقات شراب و قمار اور دیگر غلط کاریوں میں گزارتے تھے۔
وہاں مسلم سپاہی نماز۔ اوراد۔ اذکار میں مصروف ہو جاتے تھے۔ تین
چار سال تک تو جنگ کی طرف ہی طبائع لگ گئیں۔ لیکن عین جنگ
میں بعض افراد کی توجہ زبور کے بعض حصص کی طرف منعطف ہو گئی
جو بائیبل میں جناب داؤد علیہ السلام کی طرف منسوب کئے گئے ہیں
اور جو عیسائی کتاب الصلوٰۃ میں درج ہیں۔ ان میں طرح طرح کی
بد دعائیں دشمنوں کے حق میں تجویز کی گئیں ہیں اور ہمیشہ سے گرجوں
میں پڑھی جاتی ہیں۔ ضرور تھا کہ جنگ میں یہ زبور بطور دعا پڑھی جائے
اس پر بعض ضمیریں گھبرا اٹھیں چاروں طرف سے یہ آوازیں آنی شروع
ہوئیں کہ اس قسم کی بد دعائیں اور لعنتیں تو خدا کی طرف سے الہام نہیں ہو سکتیں۔
خود بعض پادریوں نے اپنی کتابوں میں سے ان کو قلمزن کر دیا۔ خصوصاً
زبور نمبر ۱۰۵ کو آخر کار کلیسا کو یہ باتیں کتاب الصلوٰۃ سے خارج کرنی
پڑیں۔ عیسائیوں کی کتاب صلوٰۃ تو روز ہی بدلتی رہتی ہے اس وقت
بھی پھر اس کی تبدیل و تنسیخ زیر غور ہے۔ لیکن زبور تو الہامی کتاب
مانی گئی تھی اور بائیبل کا ایک حصہ ہے اس لئے اُس کے خدا کی طرف
سے نہ سمجھے جانے نے انجیل و توراۃ کی صحت پر از سر نو شکوک

پیدا کر دیئے۔ یہ بھی کہا گیا۔ کہ یونس کی مچھلی کا قصہ بھی صحت سے معرا ہے
پچھلی صدی میں بھی اس پر شکوک پیدا ہوئے لیکن ویل مچھلی
کے قبضہ انسانی میں آجانے نے متشکک طبائع کا جواب پیدا کر دیا
چنانچہ جناب یونس کے قصہ بائبیل میں جہاں مچھلی کا ذکر تھا وہاں
مترجمین نے لفظ ویل لفظ مچھلی کی جگہ رکھ دیا۔ ویل اس قدو قامت
کی مچھلی ہے کہ اگر اس کے قدو قامت کے لحاظ سے اُس کا گلا اور
قیاس کر لیا جائے تو ایک نہیں کئی انسان اُس کے اندر جا سکتے ہیں
اسی طرح سے ماہی یونس کے متعلق حضرت یونس کے نگل جانے کے
طے ہو گئی۔ بدقسمتی سے چند سال کے بعد یہ بات علم میں آ گئی کہ ویل
جسامت میں گو کل مچھلیوں سے بڑی ہے۔ لیکن اُس کا گلا اس
چھوٹا ہے کہ اُس کی خوراک چھوٹے سے چھوٹے دریائی کیڑے مکوڑے
ہوتے ہیں وہ اپنا منہ کھول کر میلوں پانی پیتی ہوئی سمندر میں چلی جاتی
ہے۔ پانی تو اُس کے گلپھڑوں کے ذریعے باہر نکلتا جاتا ہے لیکن پانی
کے ساتھ جو کیڑے مکوڑے اندر چلے جاتے ہیں وہ ایک قسم کی جالی
چیز کے ذریعے اندر رہ جاتے ہیں۔ جب یہ صورت ہے تو ویل نے
جناب یونس کو کیا نگلنا تھا۔ آخر کار ترجمہ بائبیل سے لفظ ویل کا
پھر لفظ مچھلی ڈالنا پڑا۔ یہ باتیں آخر کب تک قائم رہ سکتی تھیں علم و عقل

نے اس کی مخالفت کی۔ خود پادریوں نے اس قصہ کو بے بنیاد تسلیم کیا اور غالباً "کنٹربری" میں ہی جو آرچ بشپ کا مقام ہے یہ امر زیر بحث آیا۔ توریت کے اس قصے کو تو آسانی سے پادری متروک اور الحاقی سمجھ سکتے تھے، لیکن وہ جناب مسیحؑ کے قول کو کیا کریں گے جہاں وہ اس قصّہ کی صحت کو تسلیم کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ

"اس قوم (یہودی) کو کوئی نشان نہ دیا جائے گا مگر وہ جو یونسؑ کی قوم کو دیا گیا۔"

یعنی جس طرح مچھلی کے پیٹ میں جناب یونسؑ رہے اور پھر دو تین دن کے بعد اُس میں سے نکلے اُسی طرح ابن آدم (مسیحؑ) تین دن زمین میں رہے گا اور وہاں سے نکلے گا۔

یہ امر مسلّم ہے کہ عیسوی مذہب کے کونے کا پتھر مسیحؑ کا قبر سے نکلنا ہے پھر یہ مسیحؑ کی ایک عظیم الشان پیشگوئی بھی ہے۔ آپ نے اس واقعہ کو یونسؑ کے واقعہ کے ذریعے مشرح کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جناب مسیحؑ قصہ یونسؑ کو صحیح سمجھتے ہیں دوسری طرف مسیحی علما اسے صحیح نہیں سمجھتے۔ اب ہم جناب مسیحؑ کے متعلق کیا خیال کریں ہمارے نزدیک تو یہ ایک نبی کی بھی شان سے بعید ہے کہ اُس پر قصہ یونسؑ کی صحت یا اُس کا غلط ہونا منکشف نہ ہو۔ چہ جائیکہ مسیحؑ کو خدا یا ابن خدا خیال کیا جائے۔ اگر

قصۂ یونسؑ از قسم اباطیل ہے تو لازماً یہ پیشگوئی یا تو مسیحؑ کی طرف سے نہیں اور یہ باتیں بعد میں انجیل کے ساتھ ملحق کی گئیں۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔ ورنہ معاذاللہ مسیحؑ کی کوئی حیثیت قائم نہیں رہتی۔ یہ باتیں کب تک ضمیر انسانی کو دبا سکتی تھیں آخر ۱۵۔جولائی ۱۹۱۷ء کو بمقام کنٹربری ایک کانووکیشن میں بصدارت آرچ ڈیکن سٹوکس یہ باتیں بڑی شدومد کے ساتھ زیر بحث آگئیں ؛

انگلستانی کلیسا میں جب کوئی پادری **ڈیکن** بنایا جاتا ہے تو اُس سے بعض اظہار بطور سوال و جواب لئے جاتے ہیں۔ اُس میں تیسرا سوال و جواب حسب ذیل ہوا کرتا ہے۔

سوال۔ کیا آپ جو کچھ نئے پرانے عہدنامجات (بائیبل) میں ہے اُن سب کو بلا تصنع قبول کرتے ہیں ؟

جواب۔ میں قبول کرتا ہوں۔ بیان یہ کیا گیا کہ اس قسم کے بیان دینے کے لئے اب پادری تیار نہیں جس سے مراد یہ تھی کہ وہ صحت بائیبل کو تسلیم نہیں کرتے اس سوال و جواب کی جگہ کمیٹی نے جو سوال و جواب تجویز کئے وہ حسب ذیل تھے ؛

سوال:۔ کیا آپ نئے پرانے عہدنامہ کی وہ تمام باتیں مانتے ہیں جو مختلف حصص میں اور مختلف طریق پر خدا کے اُس الہام کو لاتی ہیں۔

جس کی تکمیل عیسیٰ مسیحؑ میں ہوئی ؟

جواب - ہاں اس نئے تجویز کردہ سوال نے کہاں تک انجیل توریت کی الہامی حیثیت کو گرادیا وہ **ڈین آف کنٹربری** نے اس تجویز کی ایک ترمیم پیش کرتے ہوئے بیان کردی انہوں نے کہا کہ یہ تجویز کردہ سوال کتب مقدسہ کے الہامی ہونے کی اہمیت پر زور نہیں دیتا - حالانکہ ان کا الہامی ہونا عیسائی مذہب کا ایک ضروری حصہ ہے - اس لئے انہوں نے سوال مجوزہ کی بصورت ذیل ترمیم کردی -

سوال - کیا آپ قبول کرتے ہیں کہ نئے اور پرانے عہد نامجات کے صحائف مقدسہ خداتعالیٰ کے الہام سے ہیں اس پر کرائیسٹ چرچ کے **ڈین** نے کہا کہ یہ تو اسی سوال کی دوسری شکل ہے جس کو ہم بدلنا چاہتے ہیں بہرحال اس پر ووٹ لئے گئے پانچ نے تو ڈین آف کنٹربری کی حمایت کی لیکن تریسٹھ پادریوں نے مخالفت کی یہ سب کچھ کنٹربری میں ہوا جو انگلستان میں کلیسا کا سرچشمہ ہے اُس سے یہ امر تو فیصل ہو گیا کہ نوّے فیصدی مسیحی علماء موجودہ انجیل و توریت کو کل کا کل خدا کی طرف سے نہیں مانتے - بہت رد و کد کے بعد سوال کی شکل ذیل منظور ہوگئی "کیا آپ پرانے عہد نامجات کی اُن باتوں کو مانتے ہیں - جو مختلف حصص میں اور مختلف پیرایوں میں خدا کے اُس الہام کو لائیں جو ہمارے خداوند مسیحؑ

میں پورا ہُوا"۔

یہ امر تو ظاہر ہے کہ معلمین مسیحیت میں سے نوّے فیصدی موجودہ انجیل و توریت کو کل کا کل الہامی نہیں مانتے یہ لوگ انجیل توریت کی صرف وہ باتیں ماننے کو تیار ہیں جن سے مسیحؑ کی ذات اور ان کے متعلق اِن کے معتقدات ثابت ہوتے ہیں خدا کی شان ہے کہ انسان جب صحیح اور معقول عقاید سے تمسک نہیں کرتا تو علم و دانش سے بھی الگ ہو جاتا ہے۔ یہ پادری صاحبان تمام کے تمام یونیورسٹیوں کے گریجوئیٹ ہیں۔ ان کے اپنے نصاب تعلیم میں منطق اور علم کلام ہے۔ انجیل و توریت کے باقی حصص کو غیر الہامی قرار دے کر یہ کس طرح اُن حصص کو الہامی مان سکتے ہیں جن میں مسیح کا ذکر ہے اگر تو دنیا کی کسی اور کتاب یا صحیفے میں جناب مسیحؑ کا ذکر ہوتا، تو اس کی تطبیق پر انجیل و توریت کے وہ حصص مان لیے جاتے، جو مسیحؑ کے متعلق ہوتے لیکن یہ تو صورت نہیں۔ انجیل توریت کے سوا کسی اور کتاب میں مسیحؑ کا پتہ نہیں چلتا ہاں یہودی مورخ جوسیفس کی تاریخ میں ایک آدھ ورق مسیحؑ کے حالات کی طرف اشارہ کرتا ہے لیکن وہ ورق آج خود ارکان کلیسا کے نزدیک بھی جعلی ثابت ہو چکا ہے اس کے علاوہ کتب خانہ پوپ (روما) میں ایک چٹھی بھی موجود ہے جو پیلاطوس کی طرف سے قیصر روم کے نام لکھی ہوئی بیان کی جاتی ہے یا قسمتی

سے وہ چٹھی اور اس پر پیلاطوس کے دستخط دونوں آج جعلی قرار دیئے جا چکے ہیں پھر توریت انجیل کے سوا جنابِ مسیحؑ اور اُن کی حیثیت کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ قرآن کریم ایک بعد کی کتاب ہے علاوہ ازیں کتاب حمید اُن کے لئے کوئی سند نہیں۔ اب اگر کوئی ان سے پوچھے کہ مسیحؑ کو کیوں ملنتے ہو، تو اس کا جواب ملے گا کہ انجیل توریت کے بعض حصص کی بنا پر، پھر اگر یہ پوچھا جائے کہ توریت انجیل کے ان مختصہ حصص کو کیوں مانتے ہو، تو اس کا جواب یہ دیں گے کہ اُن میں مسیحؑ کا ذکر ہے کیا یہ تسلسل دوری یا مصادرہ الی المطلوب نہیں یہ تو ایک موٹا منطقی مغالطہ ہے اس امر پر میں نے اسلامک ریویو جلد نمبر ۵ میں مفصل بحث کی ہے :۔ بہرحال کنٹربری کی اس کانووکیشن نے جو دراصل انگلستانی کلیسا کی قائم مقام تھی قرآن کریم کی صداقت پر مہر کر دی۔ قرآن کریم نے بھی تو یہی کہا تھا کہ انجیل توریت میں تحریف ہو گئی ہے، لوگوں نے خود ہی بعض باتیں لکھ کر خدا کی طرف منسوب کر دی ہیں، یہ تو نہیں کہا کہ یہ کتابیں کل کی کل انسان نے بنائی ہیں قرآن مجید نے ان کتابوں کو خدا کی طرف سے ہدایت سے خالی نہیں کہا بلکہ فرمایا فیھا ھدًی ونور (یعنی اس میں نور اور ہدایت بھی ہے)

اگر مذہب انسان کے لئے ایک پیاری سے پیاری چیز ہے، اور انسان طبعًا چاہتا ہے کہ وہ اپنے مذہب کو اُس کی اصلی شکل وصورت

میں دیکھے، تو پھر کیا قرآن نے دنیا پر احسان نہیں کیا، اور خصوصاً عیسائیوں کے ساتھ محبت کا سلوک نہیں کیا، جب اُن کو اطلاع دی کہ جس کتاب پر تم اپنے مذہب اور ایمان کا حصر رکھتے ہو وہ قابلِ اعتبار نہیں۔ یہ باتیں اگر اُس وقت مان لی جاتیں تو دنیا کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ لیکن میں تو اب بھی ان لوگوں کی دل سے عزت کرتا ہوں، اور اُن کی اخلاقی جراُت کا مداح ہوں جس وقت بھی اُن پر حقیقت کا انکشاف ہُوا، وہ اپنے غلط معتقدات سے الگ ہو گئے اور دنیا کو اس سے اطلاع دے دی۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء میں **وسٹ منسٹر** گرجا کے **ڈین** نے (جو لنڈن کا شاہی گرجا ہے) بچوں کے نصاب تعلیم کے مذہبی حصے پر بحث کرتے ہوئے ایک جلسہ میں فرمایا کہ

> "اگر ہم اس نصاب میں کتاب پیدائش کی کہانیاں رکھ دیں، تو آیندہ نسل یہی سمجھے گی، کہ ہمارا معیار صداقت بہت ہی ادنیٰ درجے کا تھا"

یہ معنی خیز فقرہ کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ اس سے مراد یہ ہے۔ کہ کتاب پیدائش کی کہانیاں اس فاضل آلہیات کے نزدیک خالی از صداقت ہیں۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ کلیسا نے اپنے مذہب کی بنیاد اُن اصولوں پر رکھی ہے جن کے لئے ان کی کہانیوں کو صحیح ماننا ضروری ہے مذہب کی بنیاد الوہیت مسیحؑ اور کفارۂ مسیحؑ ہے۔ اور کفارہ کی ضرورت

گناہ آدم سے پیدا ہوتی ہے۔ میں مقبولہ مسیحی مذہب کی کہانی ذیل کے دو لفظوں میں بیان کر دیتا ہوں۔ آدم نے گناہ کیا۔ یہ گناہ انسان کی فطرت میں آگیا اس سے انسان مستوجب سزائے ابدی ٹھہرا۔ محبتِ خدا نے عذاب سے بچانا چاہا۔ عدل کے تقاضے نے سزا چاہی۔ کفارہ کی ضرورت پڑی۔ کوئی اور انسان فطرتاً گنہگار ہونے کے کفارہ نہ ہو سکتا تھا آخر خدا خود کفارہ ہوا۔

اس داستان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کلیسی مذہب کا بنیادی پتھر قصہ آدم مندرجہ کتاب پیدائش ہے۔ اب اگر قصہ آدم ہی بقول **ڈین** ویسٹ منسٹر غلط ہے، تو پھر کل مسیحیت کی کہانی غلط ہو جاتی ہے خیر یہ امر تو آج ڈین موصوف نے کہا لیکن **گناہ فطرتی یا موروثی** کے مسئلہ سے تو مدتوں پہلے اکثر فضلائے مسیحیت نے انکار کر رکھا ہے۔ خدا تعالیٰ کا درود و سلام اُس افضل البشرؐ انسان پر ہو، جس نے دُنیا کو یہ بشارت دی، کہ ہر ایک انسانی بچہ، خواہ وہ کسی گھر میں پیدا ہو، دنیا میں صحیح فطرت لے کر آتا ہے خدا کا احسان ہے، کہ عیسائیت کا یہ بنیادی عقیدہ، یعنی گناہ موروثی ہے، قریب قریب علمائے نصرانیت کے طبقہ سے مٹتا جاتا ہے، یہ زمانہ علم وفضل کا ہے۔ مغربی دنیا انجیل کی ہر ایک بات ماننے کو تیار نہیں۔ قرآن کریم اگر انجیل کے محرف ہونے کا پتہ نہ بھی دیتا، تو بھی بعض انجیلی روایتیں اُسے الہامی پایہ سے گرا دیتیں۔ ہم مسیحؑ کو خدا کا پیارا نبی مانتے ہیں۔

ہم انجیل کی کسی ایسی بات کو ماننے کے لیئے تیار نہیں، جو نبی کی شان کے شایاں نہ ہو۔ نبی اخلاق حسنہ کا ایک نمونہ ہوتے ہیں۔ اخلاق منزلیہ چاہتے ہیں کہ بیٹے والدین کا ادب کریں خصوصًا والدہ کی عزت کریں قرآن مجید اطاعت میں خدا کے بعد والدین کا مقام قرار دیتا ہے ۔لیکن انجیل میں جناب مسیحؑ، مریمؑ صدیقہ سے کچھ ایسی بے رخی اور بے مہری کرتے ہیں، جو بہتر اخلاق سے بہت بعید ہے۔ یا قصہ الحاقی ہے۔ یا جناب مسیحؑ شان نبوت سے گر جاتے ہیں۔ قرآن مجید اس واقعۂ انجیل کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے مسیح اپنی والدہ کی بہت عزت و توقیر کیا کرتے تھے۔ ہم مسیحؑ کو نبی تو ہی قرار دے سکتے ہیں۔ جب انجیل کی ایسی روایات کو غلط قرار دیں۔

خیر ہم تو انبیاء علیہم السلام کے متعلق ایک خاص عزت دل میں محسوس کرتے ہیں۔ لیکن ہم اکابر علماء مسیحیت کو کیا کہیں جو خود مسیحؑ کے متعلق بعض وقت بری طرح منہ کھول دیتے ہیں۔ آج کل انگلستان میں مسئلہ طلاق پر گفتگو ہو رہی ہے۔ انجیل میں جناب مسیحؑ کے ایک فقرے نے مسئلہ طلاق میں ایک خطرناک مصیبت ڈال رکھی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ

"جس مرد و عورت کو خدا نے ملا دیا اُسے کوئی جُدا نہیں کر سکتا"

اس ارشاد کے ماتحت طلاق ایک امر ناممکن ہے۔ حالانکہ بعض حالات طلاق کی از حد ضرورت پیدا کر دیتے ہیں۔ کل عیسائی دنیا نے تو قریبًا اس

ارشاد کو پس پشت کر دیا، لیکن انگلستان اس معاملے میں ڈگمگاتا رہا۔ ہاں اب دوسرے عیسائی ملکوں کی طرح انگلستان بھی اسلامی صورت طلاق کی طرف آرہا ہے۔ بہرحال اس وقت اس مسئلہ پر بڑی شد و مد سے بحث ہو رہی ہے۔ اس کے ضمن میں بشپ آف ڈرہم مسیحؑ کے ارشادِ بالا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ،

"اگر مسیحؑ ہمارے زمانے میں ہوتا تو زیادہ عقلمندی سے کام لیتا"

العظمت للّٰہ۔ کلیسا کا بشپ جو مسیحؑ کو خدا بھی کہے اور یہ باتیں بھی کہے۔ میری اسلامی غیرت جو ہر مسلم دل میں جناب مسیحؑ سے ہے کب گوارا کرتی تھی، کہ میں یہ بات سنوں اور خاموش رہوں۔ چنانچہ اسلامک ریویو کے ذریعے میں نے بشپ موصوف کو اطلاع دی، کہ "جناب مسیحؑ تو اپنے زمانے کے دانا اور بہترین انسان تھے، وہ آج بھی ویسے ہی ہوتے۔ اُنہوں (مسیحؑ) نے اس ارشاد کے ذریعے یہودیوں کی اصلاح کرنی چاہی تھی، جو ہر روز طلاق دیتے اور نیا نکاح کرتے تھے۔ یہ تو ایک وقتی حکم تھا۔ البتہ تم لوگ جاہل اور نادان ہو، جو خدا کے نبی کو اس طرح یاد کرتے ہو۔ یہ تو تمہارا قصور ہے، کہ تم نے پہلے نامعقول باتیں اُن کی طرف منسوب کیں، یا وقتی باتوں کو قطعی قرار دیا، اب تمہیں تکلیف ہوتی ہے اور مسیحؑ کو مطعون کرتے ہو۔"

قرآن کریم نے ایک اور بات بھی مسیحؑ کے متعلق بیان فرمائی ہے۔ دنیا اُسے اگر پہلے ہی تسلیم کر لیتی تو آج عیسائی مسلمانوں میں یہ جھگڑے کیوں پڑتے۔ بروئے قرآن مجید قیامت کے دن مسیحؑ سے خدا دریافت فرمائے گا۔ کہ کیا تو نے اپنی اور اپنی ماں کی الوہیت کی تعلیم لوگوں کو دی تھی وہ اس امر سے انکار کرے گا اور کہے گا کہ یہ مذہب میرا تعلیم کردہ نہیں۔

وَإِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَ أَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَأُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۖ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْ أَنْ أَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ ۖ إِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ۖ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَا أَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ۖ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ○ مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِيْ بِهٖ أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۖ وَأَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ○ (المائدۃ ۱۱۶، ۱۱۷)

(ترجمہ) اور جب اللہ نے کہا اے عیسٰی ابن مریم کیا تُو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کے سوا دو معبود بنا لو۔ کہا تو پاک ہے۔ مجھے کہاں شایاں تھا کہ میں وہ کہوں جس کا مجھے حق نہیں اگر

میں نے ایسا کہا ہوتا تو تجھے ضرور اس کا علم ہوتا۔ تو جانتا ہے
جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تو مخفی رکھتا ہے۔
کیونکہ تو غیب کی باتیں جاننے والا ہے۔ میں نے اُن سے کچھ نہیں
کہا مگر وہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا کہ اللہ کی عبادت کرو جو میرا
ربّ اور تمہارا ربّ ہے اور میں ان پر گواہ تھا جب تک بھی اُن میں
تھا۔ پھر جب تو نے مجھے وفات دے دی۔ تو تُو ہی اُن پر نگہبان تھا
اور تو ہر چیز پر گواہ ہے ؀ (المائدۃ ۱۱۶ - ۱۱۷)

ان آیات سے مراد ہے، کہ جو کچھ کلیسائے مغرب، اور اُس کی اتباع میں عیسوی دنیا، جناب مسیحؑ کے نام پر تعلیم دے رہی ہے اُس کو آپ کی ذات سے کوئی تعلق نہیں، قرآن مجید کی اس تعلیم کو بھی آخر کار عیسائی دنیا نے آج تسلیم کر لیا۔ ۹ اگست ۱۹۱۷ء سنہ کو گرٹن کالج کیمرج میں ایک دلچسپ جلسہ منعقد ہوا، جس میں چوٹی کے پادریوں نے حصہ لیا۔ سینٹ پال کے گرجا کے بڑے پادری ڈین انجی صاحب نے جو ایک مشہور فاضل ہیں ایک تحریر پڑھی، سوال زیر بحث یہ تھا کہ کیا مسیحؑ نے موجودہ کلیسا قائم کیا ڈین موصوف نے دوران تقریر میں بیان کیا کہ مسیحؑ اپنے معاصرین میں ایک نبی کی حیثیت میں ظاہر ہوئے انہوں نے کبھی موسوی تعلیم سے انحراف نہیں کیا، نہ کوئی نئی تعلیم دی نہ موسوی

مذہب کے مقابل کوئی نیا مذہب قائم کیا۔ روحانی معاملات میں وہ بالضرور آزادی چاہتے تھے، لیکن اپنے ملک اور وقت کی باتوں کو انہوں نے قبول کیا۔ اس پر موسوی مذہب سے جدائگی تو ایک لازمی امر تھا۔ لیکن مسیحؑ نے عیسائیوں کے لئے کوئی اصول یا تعلیم خود تجویز نہیں کی۔ **ڈین انجی** کے الفاظ سے صاف نظر آتا ہے کہ مروجہ کلیسی تعلیم کو جناب مسیحؑ سے کوئی تعلق نہیں۔ حاضرین جلسہ میں سے صرف ایک بزرگ پادری **جے۔ آر ونکنس** کا جواب اس سوال پر کہ "آیا مروجہ کلیسا کا بانی مسیحؑ ہے"، اثبات میں تھا۔ باقی سب اصحاب کا جواب نفی میں۔ انجیل کے خود دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کلیسا کی یہ باتیں مسیحؑ کی نہیں ہیں تو **پولوس** کی باتیں ہیں۔ جس نے مسیحؑ سے نہیں، بلکہ مسیحؑ سے پہلے کے فلسفے سے لیں۔ اناجیل ثلاثہ کا مسیحؑ، اور پولوس کا مسیحؑ، دو متضاد شخصیتیں ہیں۔ مسیحؑ شریعت منواتا ہے۔ پولوس شریعت چھڑواتا ہے۔ روس کا مشہور مصنف **کاؤنٹ ٹالسٹائے** جو مسیحؑ اور پولوس کو ایک وقت قبول نہ کرسکتا تھا۔ آخر اُس نے اس لاینحل امر کو طے کیا۔ کہ اُس نے پولوس کو جواب دے دیا۔ فی الواقعہ اگر پولوس کی تحریر کو ایک طرف کردیا جائے تو پھر ایک منٹ کے لئے بھی یہ نظر نہیں آتا، کہ مسیحؑ کے اپنے الفاظ کہاں تک اُس مذہب کے متحمل ہوسکتے ہیں جو آج مسیحؑ کے نام پر دنیا میں

پھیلایا جا رہا ہے اور یہ امر ظاہر ہے کہ مسیحؑ کے الفاظ تو آپ کو خدا نہیں بناتے۔ جب انگلستان کے بڑے بڑے معلمانِ مسیحیت نے من وجہٗ یہ قرار دے دیا کہ موجودہ مذہب کلیسا کو مسیحؑ سے کوئی تعلق نہیں، تو اس کے بعد اُن کا یہ فرض بھی تھا کہ مسئلہ الوہیت پر کچھ روشنی ڈالیں۔ یہ امر آخر کار بمقام آکسفورڈ اگست ۱۹۲۱ء میں پادریوں کی ایک کانگرس نے فیصلہ کیا اور مسیحیت کے ایک فاضل ڈاکٹر **ریشڈل ڈین کارلائل** اس مسئلے پر گفتگو کرنے کے لئے مقرر ہوئے۔ آپ نے فرمایا، کہ اگر ہم مسیح کے نام یا ذات کے ساتھ الوہیت کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس لفظ کے مفہوم میں ذیل کی باتیں کبھی ذہن میں نہیں رکھنے۔

اوّل ۔ جناب عیسیٰ نے کبھی اپنی ذات کے لئے الوہیت کا دعویٰ نہیں کیا۔ یہ ممکن ہے کہ دوسرے اُسے (مسیحؑ کو) کہتے رہے ہوں اور اُس نے اُنہیں نہ روکا ہو۔ مگر جو باتیں اُس کے مُنہ سے نکلی ہیں، خواہ وہ نازک سے نازک وقت پر کیوں نہ نکلیں۔ اُن سے صاف پایا جاتا ہے۔ کہ جناب عیسیٰؑ خدا کے ساتھ اپنا رشتہ، خدا اور انسان کا سمجھے۔ چوتھی انجیل (یعنی یوحنا) میں، اگر اُن کی بعض تقریریں اس بات سے آگے جاتی ہیں تو وہ "تاریخی پایہ سے گری ہوئی ہیں۔[۱]

---

[۱] اس میں شک نہیں کہ انجیل یوحنا میں بعض فقرے ایسے ہیں جن سے مسیحؑ کے مناد آپ کی الوہیت ثابت کرتے ہیں ڈین موصوف کے نزدیک یہ انجیل تاریخی حیثیت نہیں رکھتی۔ تثلیث کا ثبوت بھی اس انجیل کی ایک دو آیات سے نکالا جاتا ہے، لیکن یہ آیتیں پُرانے نسخوں میں نہیں

دوم - اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ مسیح ہر معنوں میں انسان تھے وہ مجسّما ہی خدا نہ تھے، بلکہ اُن کی روح، قوت تعقل قوت ارادی، سب انسانی تھی۔

سوم - یہ بھی قدیمی عقیدہ نہیں کہ مسیحؑ کی انسانی روح، ازل سے موجود ہے۔ ہاں اگر کل انسانوں کی روحیں قدیم سے موجود ہوں تو یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے۔ لیکن یہ مسلمہ عقیدہ نہیں۔

چہارم - الوہیت مسیحؑ سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ وہ بن باپ ضرور ہی تھے، یا صاحب معجزہ تھے۔ اگر تاریخاً اُن کی پیدائش ایسی ہی ثابت ہو تو بھی یہ الوہیت کا مظہر نہیں اور اگر یہ امر ثابت نہ ہو، تو اس سے بھی اس مسئلہ میں فرق نہیں آتا۔

پنجم - مسیحؑ کی الوہیت علم غیب، یا علم کل پر مشتمل نہیں۔ اس بات کے فرض کرنے کی بھی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ کہ مسیحؑ کا علم اپنے معاصرین سے کوئی زیادہ تھا (مثلاً) جنّوں کا سر سے نکالنا (آج اگر) اسے ایک دماغی مرض سمجھا گیا ہے (اور مسیحؑ کے معاصر اُسے جن سمجھے تھے) تو مسیحؑ

(بقیہ ص۳۶) مترجمان انجیل نے شاہ جیمس کے زمانے میں جعلی تسلیم کیں اور حاشیے کے نوٹ میں ایسا تسلیم کیا۔ سمجھ نہیں آتی کہ کیوں اس حاشیہ کو مروجہ انجیل یوحنا میں نہیں دیا جاتا۔

کو ایسا ہی سمجھتے تھے۔ آج اگر توریت کی پہلی پانچ کتابوں اور مزامیر کے مصنف کے متعلق کوئی اور رائے ہے، تو اس سے بھی مسیحؑ ناواقف تھے۔ اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا، کہ جناب مسیحؑ کو کچھ آئندہ کی توقعات تھیں لیکن تاریخ نے اُنہیں پورا نہیں کیا ۔

حیرت کا مقام ہے کہ اس تقریر کے بعد لفظ الوہیت کے مفہوم میں کونسی بات رہ جاتی ہے جو مسیحؑ کو خدا بنائے۔ نفس ناطقہ سے انسان حیوان میں تمیز ہوتی ہے نفس ناطقہ کی تین بڑی صفات روح عقل اور قوت ارادی ہیں۔ اب اگر بقول ڈین مسیحؑ میں یہ تینوں باتیں اُسی قسم کی ہیں جو انسان میں ہوتی ہیں، تو پھر وہ کن معنوں میں خدا ہے اگر اُن کی روح کی پیدائش بھی اُن کے جسم کے ساتھ ہی ہے جیسے کہ ڈین موصوف سمجھتے ہیں، تو ازلی۔ ابدی خدا نے انسان میں جنم نہیں لیا۔ مسیحؑ کے بن باپ ہونے سے ڈین موصوف انکاری نظر آتے ہیں۔ لیکن بفرض محال اگر آپ کی پیدائش ایسی ہی تھی تو بھی ڈین کے نزدیک یہ کوئی وجہ خدائی نہیں ہو سکتی معجزات کا بھی یہی حال ہے لیکن ڈین موصوف نے جو بات فقرہ نمبر پانچ میں کہی ہے اُس سے تو خُدا چھوڑ مسیحؑ معاذاللہ مجھے نبی بھی نظر نہیں آتے نبی تو خدا تعالیٰ سے علم لے کر آتے ہیں۔ لفظ نبی کے معنی ہی یہی ہیں۔ یہ لوگ

انسانی علم کو غلطی سے پاک کرنے آتے ہیں ڈین موصوف کے فقرہ تیم
کی مراد یہ ہے، کہ جناب مسیحؑ کے زمانہ میں مرض ہسٹیریا سے کوئی واقف
نہ تھا۔ لوگ اسے جنوں کا یا دیوؤں کا آسیب سمجھتے تھے۔ مسیحؑ بھی یہی سمجھتا
تھا۔ اُس کے معاصر توریت کی پہلی پانچ کتابوں کو جناب موسیٰؑ سے اور
زبور کو جناب داؤد سے منسوب کرتے تھے۔ آج کی تحقیق نے یہ
باتیں غلط قرار دی ہیں۔ لیکن جناب مسیحؑ بقول ڈین اس امر میں
دوسروں کی طرح غلطی میں تھے ڈین کی تیسری بات نے تو الوہیت
چھوڑ، آپ کی نبوت کا بھی صفایا کر دیا نبوت کے ایک معنی پیشگوئی
کرنا ہے۔ اس میں ڈین کا مذہب یہ ہے، کہ جناب مسیحؑ نے جو اپنے
آنے کے متعلق پیشگوئی کی تھی، وہ تاریخ نے ثابت نہیں کی۔ اب
خدا کے لئے بتلاؤ کہ کوئی مسیحؑ کو نبی بھی کیوں سمجھے؟

میرا ہمیشہ سے یہ مذہب ہے کہ اگر قرآن کریم مسیحؑ۔ موسےٰؑ یا دیگر
انبیاء علیہم السلام کو نبی نہ کہتا، تو اُن کے متعلق مروجہ صحائف کو
دیکھ کر میں اُن کو نبی نہ مانتا۔ اخلاقی تعلیم سے کوئی نبی نہیں بن جاتا۔
ایسی تعلیمیں تو دنیا کے بہت سے حکیموں نے پیش کی ہیں۔ نبی کا
تو پہلا فرض ہے کہ انسانوں کو غلطی سے نکالے۔ قربان جاؤں محمد رسول
اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قرآن کو دیکھو کس طرح صحیح علم کو دنیا میں لایا

کس طرح دنیا کے معتقدات ۔ بعض تاریخی واقعات ۔ بعض علمی معاملات الغرض ہر ایک امر ضروری کے متعلق صحیح اور سچا علم دیتا ہے ۔ مروجہ غلطیوں کی اصلاح کرتا ہے ۔ متنازعہ امور پر فیصلہ کرتا ہے اور آج سائنس اور تحقیق اُس کی تصدیق کرتی ہے اور باتوں کو تو چھوڑ دو ، عیسائی معتقدات کے متعلق جو قرآن کریم نے فیصلے کئے ، کیا آج ان معلمان مسیحیت نے جن کا ذکر میں یہاں کر رہا ہوں ، تصدیق نہیں کئے ۔ کیا صرف انہیں باتوں سے آنحضرت صلعم کا علم ، خدا کا دیا ہوا علم ثابت نہیں ہوتا اور وہ نبی صلعم نہیں ٹھہرتے نبی کا پہلا فرض یہ ہے کہ لوگوں سے سابقہ غلطیوں کو دور کرے ۔ جناب مسیحؑ دنیا کو اپنا پیغام دے گئے ۔ مگر ان کے بعد ہی اُن کے متعلق غلط تعلیمیں پیدا ہو گئیں ، ان کو اور اُن کی ماں کو خدا بنایا گیا ، تثلیث کی تعلیم دی گئی ، فطرتی گناہ ، اور کفارہ کا مسئلہ تجویز کیا گیا ، انہیں مصلوب اور معاذ اللہ ملعون قرار دیا گیا ، مختلف معجزات اُن کی طرف منسوب ہوئے ، بائیبل کو لفظاً لفظاً الہامی مانا گیا ، صرف ایمان کو عمل کے بغیر ذریعہ نجات سمجھا گیا ، شریعت کو لعنت تجویز کیا گیا ، علم و حکمت کا نام سحر اور جادو رکھا گیا ۔ توحید کے ماننے والوں کو چن چن کو قتل کیا گیا ۔ مذہب کے منوانے میں جبر کو جائز کیا گیا ، باقی کل انبیا کو خاطی گنہگار ۔ چور بٹمار کہا گیا ، خدا کے معصوموں (نوحؑ ۔ لوطؑ ۔ داؤدؑ ۔ سلیمانؑ) کے متعلق

گندے سے گندے قصے تراش کر بائیبل میں شامل کئے گئے۔ دو ہزار برس کے عرصہ میں آج آہستہ آہستہ ان سب باتوں کو خود معلمان مسیح نے غلط اور غیر صحیح قرار دیا۔ ہاں یہ بھی یاد رہے، کہ یہ سب کی سب باطل باتیں مسیح کی پانچویں چھٹی صدی تک پیدا ہو چکی تھیں۔ پس اگر خدا ہی سرچشمہ مذاہب ہے اور اُس مذہب میں جب ایسی غلط باتیں شامل ہو جائیں جو انسان کی تباہی کا موجب ہوں، اور جو خدا خیاب مسیح تک وقتاً فوقتاً اسی لئے نبی بھیجتا رہا ہو کہ انسانی علم کو غلطی سے پاک کرے۔ تو جب یہ باتیں پانچویں صدی مسیح میں پیدا ہو چکی تھیں، اور ساتھ ہی کل دیگر مذاہب کے صحائف غائب یا محرف ہو چکے تھے، اور اُن کی تعلیمات بگڑ یا مٹ چکی تھیں۔ تو کیا اُس علیم و حکیم خدا کا یہ فرض نہ تھا، کہ اُس کی طرف سے کوئی نبی آ کر انسان کو غلطی سے نکالے۔ اگر نبی اس بات کے لئے نہیں آتے تو پھر کس بات کے لئے آتے ہیں۔ اور اگر نبوت کا مشن یہی ہے اور بے شک یہی ہے تو پھر اُس نبی کا نام لو جو وقت پر آیا اور یہ مشن پورا کر گیا۔ یا اُس کے (مسیح کے) بعد آج تک کسی نے نمودار ہو کر ان خطرناک غلطیوں کا ازالہ کیا۔ ہاں **محمد صلعم** عین وقت پر آئے۔ آپؐ کا ظہور چھٹی صدی عیسوی میں ہوا آپؐ نے ایک خدائے واحد کی تعلیم دی۔ تثلیث اور شرک کی مختلف تعلیموں کو اُڑا کر توحید کو صحیح معنوں میں قائم کیا۔ دنیا کے کل انبیاء

کی عزت کی۔ اُن کو سچا۔ راستباز اور صالح بیان کیا۔ اُن کی تعلیم کو اور ایسا ہی کل دنیا کے مذاہب کو خدا کی طرف سے تسلیم کیا۔ سابقہ کتب مقدسہ کا محرف ہونا بتا کر اُن کی صحیح تعلیم پیش کی۔ انسان کو پیدائشاً صحیح اور پاک فطرت والا بیان کیا۔ ایمان اور عمل کو لازم ملزوم ٹھہرایا۔ شریعت کی عزت کی۔ قوانین آلٰہیہ پر چلنے کے ساتھ نجات وابستہ کی۔ علم وحکمت کے سیکھنے کو جزو مذہب ٹھہرایا۔ ضمیر اور مذہب میں آزادی رائے کی تاکید فرمائی۔ اشاعت مذہب میں جبر کو حرام کیا۔ انبیاء کے مکسوبہ کمالات کا دروازہ کل انسانوں پر کھولا۔ عالمگیر اخوت کو دنیا میں قائم کیا۔ ہمدردی انسانی کا نام مذہب رکھا۔ ذات پات۔ زبان۔ قوم ملک کے امتیاز کو اڑا کر نسل انسانی اور راستبازی کو پایۂ شرافت بنایا۔ یہ چند باتیں میں نے امور بالا کو سامنے رکھ کر لکھی ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ میں آپؐ کی تعلیم کو اس کتاب کے آخری حصہ میں دوں گا۔ یہاں میں بالاختصار یہ لکھ دیتا ہوں، کہ دنیا کی کوئی تعلیم جو صحیح تھی، اُس کی آپؐ نے تائید فرمائی اور دنیا کے ہر ایک ایسے عقیدے یا تعلیم کی دلائل کے ساتھ بیخ کنی کی، جو انسانی اخلاق۔ معاشرت یا بہبودی کے خلاف تھی۔ اور ہر ایسی صداقت کو جو مذہب کی روح رواں ہے۔ اور قریب قریب ہر ایک مذہب کے مسلمات میں سے ہے۔ مثلاً ہستی باری تعالےٰ تنزیل کتب آلٰہیہ۔ ملائکہ۔ رسالت۔ حیات بعد الموت مسئلہ خیر وشر۔

بہشت دوزخ۔ ذمہ داریٔ اعمال وغیرہ وغیرہ ان سب امور کو علمی اور منطقی دلائل کے ساتھ مبرہن فرمایا۔ اللّٰھم صلی علی محمد وعلی اٰلہ واصحابہ اجمعین

اب میں پھر اصل مضمون کی طرف آتا ہوں۔ ڈاکٹر رشڈل کی تقریر کے بعد اور بھی تقریریں ہوئیں۔ اُن میں سے ریورنڈ میجر پرنسپل رپن ہال آکسفورڈ نے اس مباحثہ میں افتتاحی تقریر کرتے ہوئے ذیل کے الفاظ فرمائے انہوں نے کہا کہ۔

"جناب مسیحؑ نے نہ تو جسمانی معنوں میں ابن اللہ ہونے کا دعویٰ کیا، جیسے کہ بن باپ ہونے والے قصے سے اخذ کیا جاتا ہے، نہ انہوں نے ذہنی (روحانی) معنوں میں ایسا دعویٰ کیا، جیسے کہ نیقہ کی کونسل نے قرار دیا۔ انہوں نے اخلاقی معنوں میں ایسے ہی اپنے آپ کو خدا کا بیٹا ظاہر کیا، جیسے کہ ہر ایک انسان خدا کا بیٹا کہلا سکتا ہے یعنی انسان میں اور خدا میں ایک قسم کا باپ بیٹے کا رشتہ اس طرح سے ہے کہ انسان اُن اخلاق کو ظاہر کرے جو خدا کے ہیں"۔

ان تقریروں نے کل عیسائی دنیا کو حیران کر دیا ڈین موصوف کی تقریروں کو خوفناک سمجھا گیا، اور اُس کے نتائج کو عیسوی کلیسا کی موت سے تعبیر کیا گیا۔ ڈین مذکور سے مختلف قسم کے مطالبے ہوئے انہوں نے اس بات کی تشریح

ہیں، کہ الوہیت مسیحؑ سے مراد کیا ہے۔ اپنی تقریر کو اخبار ڈیلی ٹیلیگراف مورخہ ۲۲ راگست سنہ ۱۹۲۱ئہ میں چھاپ دیا۔ اُس میں وہ لکھتے ہیں کہ

"خداوند کا علم انسان کے ذریعے ہوا۔ یعنی انسانیت میں ربانیت کا رنگ ہے" آپ نے کہا کہ

"اگر ہر ایک انسان، کسی حد تک مظہر خداوند ہے، اور مختلف مذاہب کے بانی، اور دیگر بزرگ انسان ایسے مظہر ہوئے ہیں تو یہ بھی ممکن ہے، کہ ایک شخص میں اخلاق خدا ایک اعلیٰ اور بے عدیل پیمانے پر ظاہر ہوں، یہی ہم مسیحؑ کے متعلق اعتقاد رکھتے ہیں"

اس پر میں نے ڈین مذکور کو لکھا کہ کیا آپ کی مراد یہ ہے، کہ جو ربانی جوہر ہر انسان میں ودیعت شدہ ہے، وہ جناب مسیحؑ میں کامل طور سے ظاہر ہوا۔ اس کے جواب میں ڈین نے میری تشریح سے اتفاق نہ کیا، لیکن اپنی تقریر مجھے بھیج دی۔ جس کا ملخص میں نے اوپر دے دیا ہے۔ اس کے جواب میں میں نے انہیں لکھا۔ کہ آپ کی مرسلہ تقریر کے پڑھنے کے بعد بھی میں اسی نتیجہ پر آتا ہوں۔ بہرحال آپ مجھے اجازت دیں کہ میں کل خط وکتابت کو شائع کردوں۔ چنانچہ یہ خط وکتابت اسلامک ریویو میں شائع ہو گئی۔

ڈین موصوف نے جس کا نام مسیحؑ کے معاملہ میں الوہیت رکھا ہے اسلام اُسے کمال انسانی سے تعبیر کرتا ہے۔ ڈین سے کہیں زیادہ فصیح الفاظ

ہیں، اسی بات کو آنحضرت صلعم نے ایک مسلم کا نصب العین قرار دیا۔ آپ نے تخلقوا باخلاق اللّٰہ کا وعظ ہر مسلم کو کیا ہے۔ ہمارے نزدیک تو انسانی زندگی کا مقصد ہی یہی ہے۔ اور اگر یہ سمجھا جائے کہ یہ امر اور انسانوں کے لئے ناممکن ہے، تو پھر مسیحؑ کی آمد ہی ایک بےسود اور لاحاصل امر ٹھہراتی ہے۔ ریورنڈ اون نے اس امر کو نہایت واضح طور پر صاف کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں، کہ

> "اگر ہم خدا کے بچّے ہیں، تو ہم میں الوہیت ہے۔ لیکن اگر الوہیت مسیحؑ ہماری الوہیت سے الگ ہے تو پھر وہ ہم جیسا نہیں۔ لہذا ہم اُس جیسے نہیں ہو سکتے۔ لیکن وہ تو ہمیں اپنے جیسا بننے کو کہتا ہے"۔

الغرض عیسائی دنیا کے لئے شاید یہ نئی بات ہو۔ لیکن وہ کون مسلمان ہے جو انسان میں مظہریت ربانی کے مسئلے سے ناواقف ہے۔ حدیث بالا کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے اندر اخلاق خداوندی پیدا کرے ؛

الغرض ڈین موصوف کا مفہوم الوہیت مسیحؑ، اسلاماً کمال انسانی میں محدود ہے۔ کل قرآن کریم کی تعلیم کی منشا یہی ہے کہ انسان میں ربّانی اخلاق ظاہر ہوں اور یہ محض نظریہ نہیں، بلکہ ان اوصاف کے متصف کل کے کل انبیاء صلحا۔ اور لکھو کھا مسلم اولیاء گزرے ہیں اور ہم نے اپنی آنکھوں سے ایسے انسان

دیکھے ہیں ڈین موصوف کا یہ کہنا، کہ جناب مسیحؑ سے کل کے کل ربانی اخلاق ظاہر ہوئے، اور اس باب میں کوئی ان کا نظیر نہیں ممکن ہے کہ صحیح ہو لیکن اگر مسیحؑ کے متعلق ہمارے علم کا اخذ صرف ایک انجیل ہی ہے، تو ڈین موصوف کی یہ بات صحیح نظر نہیں آتی، اوّل تو جب انجیلی بیانات کی صحت سے ہی ڈین موصوف اور اُن کے ہم نواؤں کو، جن میں چوٹی کے پادری موجود ہیں، انکار ہو، تو پھر انجیلی کہانی کی بنا پر کسی نتیجہ پر آجانا کس طرح صحیح ہے۔ دور کیوں جائیں مارچ ۱۹۲۲ء میں ہی ڈین انجی (سینٹ پال کے بڑے پادری) نے ایوننگ سٹینڈرڈ میں ایک مضمون لکھا جس میں آپ کہتے ہیں۔

"معاملہ تصنیف میں کامیاب سے کامیاب فریب۔ اگر کہیں ہوا، تو کلیسا میں ہوا۔ ابتدائے عیسائیت ہی میں ایک وقت آگیا جب کسی کتاب کی عزت تو یہی ہوتی تھی۔ جب اُسے کسی بڑے نام پر منسوب کر دیا جائے؟ بکثرت جعلسازی شروع ہوگئی اور آج ہم وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے، کہ عہد نامۂ جدید میں بھی جو کتابیں جن کے نام پر منسوب ہیں وہ انہیں کی ہیں یا نہیں؟ پطرس کا دوسرا خط تو بالاتفاق اس کا نہیں اور عہد نامہ جدید کی بعض کتابوں کی صحت شبہ سے خالی نہیں۔"

یہ ڈین انجی کے الفاظ ہیں۔ جب مذہب کی بنیادی کتب ہی مشتبہ ہیں تو

پھر ان کے مطالب پر ایمان لانا کہاں تک صحیح ہے۔ انجیل نے جو نقشہ حیاتِ مسیحؑ کا کھینچا ہے، اوّل تو وجوہ بالا سے قابلِ تسلیم ہی نہیں۔ لیکن اگر اُسے صحیح بھی مان لیا جائے، تو بھی انہیں اخلاق ربانی کا مظہر ٹھہرانا صحیح نظر نہیں آتا۔ اُن کی زندگی مندرجہ بائیبل تو انسانی اخلاق کاملہ کو ظاہر کرتی نظر نہیں آتی۔ میں بحیثیت مسلم یہ تو ایمان رکھتا ہوں کہ جناب مسیحؑ ایک کامل انسان تھے۔ وہ اخلاق ربانی کے مظہر تھے۔ کیونکہ وہ نبی تھے۔ لیکن انجیل سے وہ ایسے ثابت نہیں ہوتے۔ یہ مان لو کہ اُن کا علم ربانی علم تھا لیکن ربانی جلال۔ ربانی علم وقدرت والوہیت وجبروت اور بیسیوں امور اس حد تک بھی ان سے ظاہر ہوتے نظر نہیں آتے، جو بعض تاریخی انسانوں میں پائے جاتے ہیں۔

جب خود معلمانِ مسیحیت اس قسم کے اعلانات کریں تو اس کا اثر جو پیروانِ مذہب پر ہونا چاہیئے وہ ظاہر ہے چنانچہ گرجوں اور عیسائی معبدوں کو مغرب میں لوگوں نے چھوڑنا شروع کر دیا ہے، گرجوں کی میزیں اور کرسیاں خالی ہو گئیں۔ سبت منانے والے اتوار کے دن خدائی گھروں کو چھوڑ کر کرکٹ فٹ بال ہاکی۔ گولف اور دیگر سیرگاہوں میں نظر آنے لگے۔ شام کی عبادت میں شامل ہونے والے سینما میں نظر آنے لگے۔ مذہب سے لاپرواہی اور اس کے اسباب اس قدر نمایاں تھے کہ آرچ بشپ آف یارک جو انگلستان

کے لاٹ پادری ہیں۔ اپنے سرمن (وعظ) میں جو انہوں نے پچھلے سال دیا یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ مذہب سے فی نفسہٖ تو اب بھی لوگوں کو محبت ہے لیکن کلیسا سے لوگ متنفر ہو گئے ہیں، مراد یہ ہے کہ دنیا دہریت یا مادیت پر، مذہب کو اب بھی ترجیح دیتی ہے۔ لیکن جس مذہب کو ہم پیش کرتے ہیں، اُس سے دنیا بیزار ہے، آپ کے اس فقرے نے اخباری دنیا میں کئی ماہ تک ایک بحث کا سلسلہ چھیڑ دیا۔ لیکن عام طور پر یہی تسلیم کیا گیا ہے کہ یہ موجودہ بیزاری تعلیم کلیسا ہی سے پیدا ہوئی ہے اسی ضمن میں اخبار ڈیلی ٹیلیگراف کے کالموں میں یہ بحث شروع ہوئی، کہ "فارن مشن" کا آج تک کیا فائدہ ہوا، یہ جو لکھوکھا پونڈ بیرونی دنیا میں پادریوں کے بھیجنے پر خرچ ہوتے ہیں، اِس سے کیا فائدہ اور بالخصوص ایسی کتاب کے منوانے پر جس کی صحت پر ہمیں خود شبہ ہے" اس کے جواب میں۔ امریکن فارن مشن کے سکرٹری موجودہ لندن کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ "آج تک فارن مشن دوسروں کو عیسائی بنانے میں ناکام رہا" البتہ انہوں نے مشن مذکور کی طبی اور تدریسی خدمات ضرور تسلیم کی ہیں۔

گذشتہ پانچ چھ سال میں جو باتیں ان معلمانِ مسیحیت نے بیان کیں، جن کا خلاصہ میں اُوپر دے چکا ہوں۔ وہ تو سب کی سب مشہورہ عقائدِ عیسوی کے خلاف تھیں مجھے تو ایک بھی بات مسیحی مذہب و کلیسا

کی مقبولہ آج نظر نہیں آتی، جس سے ۱۹۱۶ سنہ سے چل کر ۱۹۲۳ سنہ تک انکار نہ ہو گیا ہو، مثلاً مسیحؑ کی الوہیت اُس کی ابنیت مسئلہ گناہ موروثی کفارہ انجیل توریت کا الہامی ہونا۔ یا ان کے واقعات مبینہ کا ایک صحیح تاریخ کی حیثیت رکھنا پھر معجزات مسیحؑ کی اب جو تشریحات کی جاتی ہیں، وہ مقبولہ مسلمہ عقائد عامہ کے خلاف ہیں۔ رپن ہال کالج (مدرسہ الٰہیات) آکسفورڈ کے پرنسپل ریورینڈ ڈاکٹر میجر نے تو مسیحؑ کے قبر سے جی اُٹھنے سے بھی انکار کر دیا ہے اور کہا ہے کہ " ان کا موت کے بعد جی اٹھنا روحانی ہے جسمانی نہیں۔" اس طرح قبر سے اُٹھنے اور اُس کے بعد کے کل واقعات پر پانی پھیر دیا۔ جس پر عدالت کلیسا میں آکسفورڈ کے بشپ کے سامنے پرنسپل مذکور کے خلاف نالش کی گئی۔ لیکن بشپ نے ڈاکٹر میجر کو بری الذمہ قرار دیا۔ کنواری کے پیٹ سے پیدا ہونے کی کہانی کے متعلق پروفیسر پرنگل پٹیس نے ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو اپنی تقریر میں کہا کہ " اس کہانی کا پتہ پرانی روایات میں نہیں ملتا، اور یہ قصہ اگر انجیل میں داخل کیا گیا تو اس لئے نہیں، کہ اس سے مسیحؑ کی خدائی منوانا مقصود تھی، بلکہ اس لئے کہ وہ انسان سمجھا جائے، کیونکہ اُس زمانے میں ایک یہ عقیدہ بھی تھا، کہ مسیحؑ دراصل روح ہی روح ہے۔ اور اُس میں کوئی انسانی جسم کا حصہ نہیں لہٰذا ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہونا اُس

کی جسمانیت ثابت کرنے کے لئے تجویز کیا گیا۔
ان تمام واقعات نے انگلستان میں ایک کثیر تعداد تو اُن کی پیدا کردی
جو گرجے سے الگ ہو گئے، دوسرے وہ جنہیں ان بشپوں اور ڈینوں کی باتیں
سمجھ نہ آتی تھیں اور انہیں خلاف عقیدہ سمجھتے تھے، ناچار تنگ ہو کر
یکم دسمبر ۱۹۲۱ء کو آرچ بشپ کنٹربری کی خدمت میں ایک
میموریل بھیجا گیا جس پر کلیساء انگلستان کے مختلف نمایندوں کے دستخط
تھے اور ان میں ۹ بشپ بھی شامل تھے میموریل میں یہ درخواست کی گئی،
کہ ایک کمیشن کے ذریعہ ان اختلافات کی تحقیق ہو، اور کوئی اتفاق کی صورت
پیدا کی جائے۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو خطرناک فساد ہوگا آرچ بشپ نے
ایسے کمیشن کے تقرر سے انکار کیا۔ اور کہا۔ کہ اس سے اور خطرات پیدا ہو جائیں
گے، ساتھ ہی یہ بھی اشارہ کیا، کہ علم وسائنس جو کچھ کر رہی ہے اُس کو بھی نظر انداز
نہ کرنا چاہیئے، آرچ بشپ بھی کرے تو کیا کرے، جب اُس کے ماتحت ایسی کافی
تعداد فاضلان مسیحیت کی یہ جدید عقائد رکھتی ہے پھر ان میں وہ لوگ ہیں،
جو علم وفضل کے آسمان کے ستارے ہیں مثلاً **بشپ، ڈین، ڈیکن**
آرچ **ڈیکن** الہیات کے کالجوں کے پرنسپل اور پروفیسر تو وہ کیا کرے؟
ان معاملات کی اہمیت اور نزاکت آخر یہاں تک پہنچی کہ ابتدائے جون
سنہ ۱۹۲۳ء میں خود آرچ بشپ مذکور کو کنٹربری میں ایک جلسہ کرنا

پڑا جس میں زیادہ وقت اس امر کے غور میں گزارا کہ کس طرح **گلے کو منتشر ہونے سے بچائے** - اور یہ کثیر التعداد لوگ اب کلیسا سے باہر ہو گئے ہیں۔ اُن کو کس طرح واپس کیا جائے - **آرچ بشپ** کا خیال تھا کہ عیسائیت کو یہ نقصان فرقہ بندی سے پہنچا ہے۔ جس کی روک تھام کی جائے اور مختلف فرقوں کو پھر اکٹھا کیا جائے۔ لیکن بقول اخبار نیشنلسٹ مذکورہ بالا انتشار فرقہ بندی سے پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کی تہ میں تشکک اور مادّیت پرستی ہے۔ اور اسی کا فکر ہونا چاہیئے۔ لیکن میرے نزدیک اس کے اسباب کچھ اور ہیں جب ۱۹۱۷ء میں یہ بزرگ تسلیم کر چکے ہیں کہ موجودہ کلیسا کا ماخذ جناب مسیحؑ کی تعلیم نہیں تو پھر یہ باتیں کلیسا میں کہاں سے آ گئیں۔ مثلاً نسل انسانی کا ایک خطرناک مصیبت میں گرفتار ہونا، جو اُن کے ورثہ میں آدم سے آئی۔ اس مصیبت سے نجات دینے کے لئے خود خدا کا دنیا میں آنا۔ انسانی آمیزش سے بچنے کے لئے کنواری کے حمل کو اپنی قرارگاہ اور مخرج ٹھہرانا۔ نسل انسانی کو مصیبت سے بچانے کے لئے سزا کو اپنے سر لینا۔ شیطان کی خدا سے جنگ۔ خود خدا کا مغلوب و مصلوب ہو کر دشمن انسان (سانپ) کا سر کچلنا۔ کمی عذاب مخلوق کو پورا کرنے کے لئے دو دن دوزخ میں جانا۔ پھر موت پر غالب آ کر شیطان پر غلبہ پانا۔ ایمان صلیب کو شرط نجات ٹھہرانا۔ یہ وہ باتیں ہیں جو کلیسا نے ایمانیات مسیحیت میں داخل کر دی ہیں ان

سے مسیحؑ کی تعلیم کو کوئی تعلق نہیں۔ اب فرقوں کا جمع ہو جانا کس طرح ان دقتوں کو رفع کر سکتا ہے۔ آخر اُس نئی جماعت کے جو مختلف فرقوں کو ملا کر بنے گی معتقدات کیا ہوں گے، جدید الخیال فضلائے مسیحیت نے تو ان پانچ چھ سالوں میں ان باتوں سے انکار کر دیا، پس سوال یہ ہے کہ اگر یہ باتیں صحیح ہیں تو ان کو قائم رکھا جائے۔ اور اگر یہ غلط ہیں۔ تو عامتہ الناس مسیحیت ان امور کو ہرگز چھوڑ نہیں سکتے۔ جب تک ان کا ماخذ غیر مسیحی سرچشمہ ثابت نہ کیا جائے۔ یہ خیال کرنا کہ محقق فضلاء اس سرچشمہ سے ناواقف ہیں۔ ان کے علم و فضل پر حملہ کرنا ہے، وہ اغلباً اس سرچشمہ سے واقف ہو چکے ہیں مسیحؑ سے قبل کی دنیا جسے مسیحی اصطلاح میں پیگن ازم (کفر و الحاد) کہتے ہیں، اس قسم کی داستانوں اور عقائد کا گھر تھی۔ یہ امور اب متحقق ہو چکے ہیں اور مغربی فضلائے مسیحیت کی امانت و دیانت ان باتوں کو مسیحی مذہب میں دیکھنا نہیں چاہتی۔ لیکن اس راز کے طشت از بام ہونے میں بھی ایک مصیبت کا امکان ہے۔ کیونکہ انگلستان کا مذہبی نظام بھی گورنمنٹ کے نظام سے کچھ کم نہیں۔ صدیوں سے یہ دونوں نظام ایک دوسرے کے لازم و ملزوم واقع ہوئے ہیں۔ ایک کی پراگندگی دوسرے کی بنیاد ہلانے کا ان کے نزدیک احتمال رکھتی ہے۔ حالانکہ یہ بات غلط ہے صحیح عقائد و حُسنِ اعمال ہی دنیا میں کسی سلطنت کی مضبوطی کا باعث ہو سکتے ہیں۔

امانت و دیانت ہی پالیسی پر غالب آتی ہے۔ الغرض صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف تو قدیمہ عقاید کو یہ بزرگ چھوڑنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف عیسائیت کے نام کو برقرار رکھ کر آہستہ آہستہ اس کی تعلیم کی نوعیت بدلنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس کی بنیاد ستمبر ۱۹۲۲ء کے جلسے میں رکھ دی جاتی ہے۔ جب یہ علماء سنہ ۱۱۱۶ سے چل کر اگست سنہ ۱۹۲۱ء تک کل تعلیم کلیسا سے الگ ہو گئے، اور اس طرح عیسائیت کے مقبولہ مروجہ مفہوم پر خط نسخ پھیر چکے، تو اُن پر یہ لازم آگیا، کہ وہ اپنے مفہوم عیسائیت کو دنیا کے سامنے پیش کریں۔ یہ عمایدِ مذہب آکسفورڈ میں جمع ہو گئے اور ایک لمبے مباحثے کے بعد یہ قرار دیا کہ مذہب عیسویت دراصل مذہب محبت ہے یعنی یہ مذہب انسان کو خدا اور مخلوق آلہیہ سے محبت کی تعلیم کرتا ہے۔

دراصل مذہب صحیح کا موضوع بھی یہی ہے، لیکن خدا سے محبت، اور انسان سے محبت، اپنی اپنی نوعیت میں ایک دوسرے سے جداگانہ ہیں، خدا سے محبت کا اظہار انسان سے محبت کے اظہار سے بالکل الگ واقع ہوا ہے، انسان تو محبت کا محتاج ہے۔ لیکن خدا اس سے بے نیاز ہے۔ خدا سے اظہار محبت کا طریق ایک ہی ہے۔ یعنی اس کے احکام کی تعظیم کی جائے اور اس کے شعار کی عزت ہو۔ دوسری طرف مختلف انسانوں کی مختلف حیثیت مختلف طریق پر محبت کا اظہار چاہتی ہے۔ باپ۔ بیٹا۔ بیوی۔ ہمسایہ۔ اقارب

اہل شہر۔ دشمن ۔ دوست ان سب سے محبت کرنا مختلف صورتیں چاہتا ہے لہذا محبت انسان کی مختلف نوعیات کے سامنے رکھ کر اس کے حقیقی مفہوم کے اظہار کے لئے اگر کوئی جامع مانع لفظ ہے تو وہ لفظ **شفقت** ہے خصوصاً جبکہ ہمارے دائرہ محبت میں انسان کے علاوہ دوسری مخلوق بھی آجائے مذہب حقہ تو یہی ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے۔ اسی کا نام اسلام ہے آنحضرت صلعم سے جب کسی نے اسلام کی تعریف پوچھی تو آپؐ نے اس حقیقت کو نہایت ابلغ واضح الفاظ میں یوں بیان فرمایا **تعظیم لامر اللہ و شفقت علیٰ خلق اللہ** ٭

رہا یہ کہ اس مذہب کا عملی پہلو کن اصولوں اور کن تعلیمات کو چاہتا ہے اُن کا کافی مواد مجھے جناب مسیحؑ کی وصایائے مندرجہ بائیبل میں نظر نہیں آتا۔ اس مضمون پر میں اس کتاب کے آخری حصہ میں کچھ عرض کروں گا ٭

اس جلسہ آکسفورڈ میں یہ بھی تسلیم کیا گیا۔ کہ جناب مسیحؑ کے علاوہ اس مذہب محبت کے معلم اور بھی ہیں مثلاً بُدھ ان کا مذہب بھی مذہب محبت ہے، البتہ ان بزرگوں کے نزدیک اسلام اس فہرست میں داخل نہیں ہو سکتا اس بات کا فیصلہ تو انشاء اللہ اس کتاب کے آخری صفحات کر دیں گے۔ لیکن یہ امر اس جلسہ میں مان لیا گیا کہ عیسائی مذہب اس معاملہ میں کوئی خاص خصوصیت نہیں رکھتا۔ بلکہ عیسائی مذہب تو بدھ مذہب

کی ایک جھلک ہے۔ اگر تو محبت کے معنی صرف حلم۔ بردباری اور ناممکن التعمیل عفو۔ موذی انسانوں کی رسی دراز کرنے کے مواقع پیدا کرنا۔ دفع ضرر کے اسباب سے تمسک نہ کرنا وغیرہ وغیرہ ہیں۔ تو پھر بدھ کی تعلیم تو بہت ارفع ہے اُس کا ایک خفیف سا چربہ جناب مسیحؑ کی تعلیم ہے۔ جناب بدھ کا حلم۔ جناب مسیحؑ کے حلم سے بہت بڑھا ہوا ہے، پھر بُدھ کی زندگی میں تو اُس کے وصایا عملی جامہ پہنے ہوئے نظر آتے ہیں مگر یہ بات مسیحؑ کی مختصر سی زندگی میں نظر نہیں آتی۔ مسیحؑ کے حالات۔ آپ کی تعلیم۔ آپ کی بعض تمثیلیں بدھ کی باتوں سے کچھ ایسی ملتی جلتی ہیں کہ اگر مسیحی پند و نصائح کا ماخذ بدھ کی تعلیم ٹھہرا دی جائے۔ تو یہ قرین قیاس ہے چنانچہ جب مسیحی مناد پہلے پہلے چین گئے اور وہاں تعلیم بدھ میں انہیں بہت سی انجیلی حکایات و روایات نظر آئیں۔ تو بعض پادریوں نے ایک نئے انکشاف کا اعلان کیا۔ انہوں نے کہا، کہ بدھ والوں نے انجیل سے بہت کچھ سرقہ کیا ہے۔ لیکن بعد میں اُن کی گھبراہٹ کی بھی کوئی حد نہ رہی۔ جب اُنہیں یہ معلوم ہوا کہ مسیحؑ سے پانچ سو برس پہلے جناب بدھ دنیا میں یہ تعلیم لائے تھے۔ مجھے یہاں بدھ مذہب پر کچھ لکھنا مقصود نہیں لیکن اگر محبت کا پہلا مستحق کوئی انسان ہے تو اس کی مستحق صنف لطیف ہے۔

جس کی طرف جناب بدھ کی بہت ہی کم توجہ ہوئی ہے ۔ نروان کی تلاش میں بال بچوں کو دوسروں کے رحم پر چھوڑ دینا، پھر نروان حاصل کر کے بھی بیوی بچوں کی طرف ملتفت نہ ہوتا یہ عمل کچھ اس قسم کا مذہب پیش کرتا ہے جس پر عمل کرنے سے ہمارے دائرہ محبّت میں معاشرت خانگی بہت کم نظر آتی ہے۔ حالانکہ انسانی محبت کا آغاز اہل وعیال کے حلقہ میں ہی شروع ہوتا ہے ۔ جن کے ہاں اولاد نہیں ہوتی، یا جو متاہل نہیں ہوتے۔ وہ کسی دوسرے سے پوری محبّت نہیں کر سکتے۔ گھر کی زندگی ہی مزرع محبت ہے، خدا کی شان جن دو مذاہب کو یہ معلمان مسیحیت مذہب محبت کہتے ہیں اُن میں سے ایک کے بانی نے تو عورت سے شادی ہی نہیں کی ، اور دوسرے نے شادی تو کی، مگر تعلقات زناشوئی کو غیر ضروری سمجھ کر قائم نہ رکھا۔ اس موضوع پر انشاءاللہ میں آئندہ چل کر مفصل لکھوں گا ؛

واقعات مذکورہ بالا جو ۱۹۱۵ سنہء سے چل کر آج تک انگلستانی کلیسا میں ظاہر ہوئے ہیں ۔ اُن سے عیسوی کلیسا اور اُس کے عقائد جن کی بنیاد پولوس اور دوسرے قدیمی راہبوں نے ڈالی تھی، وہ آج مٹ گئے ۔ یہ میں ہی نہیں کہتا ۔ بلکہ اسی ستمبر کے گذشتہ ہفتہ میں جو چرچ کانگرس ہوئی ہے ۔ اس میں یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ آج کلیسا اور اُس کے عقائد ایک بے عمل چیز ہیں ۔ اس کا کوئی اثر غور و فکر کرنے والے لوگوں

پر نہیں رہا، اس کی باتیں قابل جواب نہیں سمجھی جاتیں، جنگ سے پہلے تو لوگ ایک عادت کے طور پر گرجوں میں آجاتے تھے، لیکن اب وہ بات ہی نہیں رہی۔" کانگرس میں جس مضمون پر جو بحث ہوئی، اُس میں ہر مقرر نے قریب قریب یہ ضرور کہا، کہ آج کلیسا کیا کر رہا ہے۔ یہ تو شہروں کا حال ہے، دیہاتیوں میں جہاں کے لوگ عموماً مذہب سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں وہاں بھی یہی رونا ہے پادری سمپسن نے تقریر کرتے ہوئے کہا، کہ جہاں گرجے میں دس آتے تھے آج پانچ نہیں رہے" پادری ہم نے نوجوان مرد عورتوں کی اخلاقی حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، کہ

"ان کی اصلاح کے لئے کیا کیا جائے۔ انہیں بائیبل کا کیا حوالہ دیں، جبکہ خود فضلاء مسیحیت کے نزدیک اس کی صحت مخدوش ہے۔ آج بیسویں صدی کی روشنی میں اُن باتوں کا کیا اثر ہوتا ہے جو عیسائیت کے تاریک زمانہ میں تجویز کی گئیں۔" فاعتبروا یا اولی الابصار۔

باتیں وہی دنیا میں قائم رہتی ہیں جو خدا کی ہوتی ہیں، انسان کا بنایا مذہب بیت عنکبوت ہی ہوتا ہے۔ آج گیارہ سال ہوئے جب ستمبر ۱۹۱۲ء کے آخری ہفتہ میں میں انگلستان پہنچا۔ میں نے عیسائی کلیسا کو پوری رونق

میں دیکھا آج ستمبر کے آخری ہفتے میں ہی یہ کانگرس ہوتی ہے جو عیسوی مذہب کی کل مقبولہ باتوں کو چھوڑ دیتی ہے اور مذہب کو نیا لباس دینا چاہتی ہے، بالفاظ دیگر پُرانا مذہب ختم اور نئے مذہب کی تلاش ہے۔ مسلمانو غور کرو اس وقت مغربی دنیا میں کیا نہیں ہوسکتا ؟

اَسَاطِیرُ الاَوَّلِین

مسیحی کلیسا کے ماخذ

انگلستانی کلیسا کے ممتاز فضلا نے تو یہ قرار دے دیا۔ جیسے کہ پہلے صفحات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کلیسا مذکورہ کی کل کی کل تعلیمات نہ صرف قایل تسلیم ہی نہیں، بلکہ انہیں جناب مسیحؑ سے کچھ تعلق بھی نہیں۔ یہ بات سچ ہے کہ مسیحی دنیا ان فضلا کے فیصلہ جات کی پابند نہیں۔ اگرچہ مشرق کے عیسائیوں نے تعلیم و ہدایت کے لئے ہمیشہ مغرب کے آگے سر جھکایا ہے لیکن یہ ضروری نہیں، کہ یہ مغربی فیصلے بھی تسلیم کر لئے جائیں چنانچہ جب ڈاکٹر رنسڈل (ڈین کارلائل) نے الوہیت مسیحؑ کی یہ نئی تشریح کی، کہ جناب مسیحؑ نہ روحاً، نہ جسماً، نہ عقلاً، نہ عملاً نہ اپنے ارادے کے برتنے میں خدا تھے، بلکہ وہ ہر معنوں میں انسان تھے البتہ متخلق باخلاق اللہ تھے یعنی اُن کے اخلاق ربّانی اخلاق تھے اور اسی قدر

ان میں الوہیت تھی اور ہمارے نزدیک جیسے کہ اوپر بیان ہوا۔ وہ ایک کامل انسان تھے اور ایسے ہزاروں انسان گزرے ہیں اگرچہ انجیل تو انہیں اتنا بھی ظاہر نہیں کرتی، لیکن ایک مسلم اُن کے متعلق ایسا ہی ایمان رکھنے پر مجبور ہے۔ مگر عیسائیوں نے عام طور پر نہ صرف ڈین مذکور کی اس تشریح کو ہی قبول نہ کیا۔ بلکہ ڈین موصوف کو عیسائیت ہی سے خارج قرار دیا۔ سیلون۔ ہندوستان۔ برما ملایا سے یہی آوازیں آئیں کہ یہ تشریح جناب مسیحؑ کو جامہ الوہیت سے معرّا کر دیتی ہے اور بات بھی سچ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے، کہ جن باتوں نے مسیحؑ کو خدا بنا رکھا ہے، اگر وہ خود ہی پایۂ ثبوت سے گری ہوئی ہوں تو ڈین موصوف اور اُس کے ہمنواؤں کا کیا قصور ہے۔ باتیں تو صرف تین چار ہی ہیں۔ جن کی بنیاد پر مسیحؑ کو خدا بنایا گیا ہے یعنی مسیحؑ کا بن باپ پیدا ہونا۔ اُن کا مصلوب ہونا۔ موت پر غالب آکر زندہ ہونا۔ اُن کا آسمان پر چڑھ جانا۔ ان امور کو فضلاً تو ہرگز صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن اگر ان باتوں کو صحیح بھی مان لیا جائے تو بھی مسیحؑ خدا نہیں ٹھہرتے۔ کیونکہ اُن سے پہلے درجن بھر انسانوں کی داستانیں ان امور کو اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔ خدا کی صفات وہی ہوتی ہیں جو بے مثل و بیچگوں ہوں اور اگر مسیحؑ سے پہلے کی دُنیا بھی ایسی ہستیوں کی مثال سے خالی نہ ہو۔ جن میں یہی باتیں پائی جاتی ہوں، تو پھر یہ

باتیں انسانی صفات میں آشامل ہوں گی اِن سے الوہیت ثابت نہ ہوگی خواہ ایسے وجودوں کی تعداد دس بارہ ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ مشکل یہ آن پڑتی ہے۔ کہ یہ کہانیاں اُن مذاہب کی ہیں جن کا نام مسیحی دنیا نے ہیگن ازم رکھا ہے۔ اب اگر یہ کل کے کل واقعات لفظاً اور معناً، حتیٰ کہ ان واقعات کی تفصیل تک ہیگن ازم کی روایات میں موجود ہوں۔ اور تاریخوں تک بھی مل جائیں، وہی دن ہوں، وہی رسمیات ہوں، رسموں کے منانے کی بھی طرز وہی ہو، اور انجیلی عیسائی روایات ومسلمات میں اور پرانی داستانوں میں صرف نام ومقام کا ہی فرق ہو، اور باقی کل کی کل باتیں ایک ہی ہوں۔ تو پھر یہ امر دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو ضرورت، وقت اور عیسائی مذہب کو ہر دل عزیز بنانے کے خیال نے قدیمی راہبوں کو اس بات پہ مجبور کر دیا کہ وہ قدیمی مذاہب کفر والحاد کی روایات کو جناب مسیحؑ اور اُن کی والدہ پر جوں کی توں چسپاں کر کے لوگوں کو یہ کہہ دیں کہ جناب مسیح میں اُن کے قدیمی خداؤں نے ظہور کیا، اور اس طرح اُس وقت کے غیر مسیحی لوگوں کو یہ یقین دلا دیں، کہ یہ کوئی نیا مذہب نہیں، یہ اُن کا ہی قدیمی مذہب ہے۔ اُن کا ہی خدا ایک دوسری شکل میں آتا ہے۔ چنانچہ اُس کے کل کے کل حالات بھی وہی ہیں۔ اس سے یہ بات ماننی پڑے گی کہ مسیحؑ سے پہلے کی ہستیاں بھی مسیحؑ کی طرح دنیا میں آئیں اور مسیحؑ کا ہی کام کر کے چلی گئیں۔

مگر اس صورت میں یہ دقت پیدا ہوتی ہے۔ کہ اگر مسیحی مذہب صداقت و راستی ہے تو انہی واقعات پر قدیمی مذاہب کو کفر و الحاد کیوں کہا جاتا ہے اور اگر اُنہیں صحیح طور پر **پیگن ازم** کہا گیا ہے۔ تو مسیحی مذہب کو کیا کیا جائے گا۔ کاش بعض واقعات ملتے جلتے ہوتے تو بھی کوئی گنجائش تھی۔ یہ تو کل کی کل وہی باتیں ہیں۔ **دوسری بات** یہ ہے کہ مسیحؑ جیسے انسان پہلے ہو چکے ہیں اور اُن کے مذاہب بھی ظہور مسیحؑ پر دنیا میں موجود تھے تو پھر آپ کی ضرورت کیا تھی۔ جس کا نام عہد جدید رکھا جاتا ہے وہ تو عہد عتیق سے بھی عتیق ہے۔ بات وہی پہلی صحیح معلوم ہوتی ہے مورخ گبن کی بھی یہی رائے ہے۔ یعنی عیسوی مذہب کو ہر دل عزیز بنانے کے لئے قدیمی راہبوں نے جناب مسیحؑ کو ایک طرف تو **متھرا۔ بعل۔ اسٹارٹی۔ بیکس۔ ایڈونس۔ آطیس آپالو۔ ہورس۔ اوسیرس۔ کوئٹیزل کوٹل** کا قائم مقام بتایا دوسری طرف ڈیمیٹر **آئی سس۔ ہرتھا۔ نانا۔ جینو۔ چلمن سملی۔ ڈائینا۔ فرگا، نینتھ** کی قائم مقام جناب مریم ٹھہرائی گئیں، کیونکہ یہ سب کی سب بیویاں اپنے اپنے ہاں **عذرا** اور کنواریاں ہی مانی گئی ہیں یہ سب کی سب بحالت بکر ہی مذکورہ بالا خداؤں کی مائیں بنیں۔ پھر سب سے حیرتناک بات یہ ہے، کہ ان سب کی پیدائش ۲۵ سے لے کر ۲۸۔ دسمبر

تک ہی واقع ہوئی ہیں۔ اور نہ صرف تاریخ ہی ایک ہے بلکہ بقول مارٹر جسٹن مسیحؑ اور اُن کی ولادت گاہیں بھی یکسانیت سے خالی نہیں جس کی تفصیل آگے چل کر کروں گا۔ میں یہاں عیسائی دوستوں کی خدمت میں بہ ادب عرض کرتا ہوں کہ وہ میری باتوں کو ٹھنڈے دل سے سنیں۔ اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ سچے دل سے اپنے معتقدات پر قائم ہیں۔ اپنے مذہب کو خدا کی طرف سے سمجھتے ہیں جو کچھ بھی وہ مان رہے ہیں اُس میں وہ خدا اور مسیحؑ کی خوشنودی سمجھتے ہیں لیکن میں اُن کی خدمت میں عرض کرتا ہوں، کہ اگر یہ امر ثابت ہو جائے کہ جس کفر و الحاد کو مٹانے کے لئے جناب مسیحؑ دنیا میں آئے، اگر وہی باتیں اُن کی تعلیم میں پھر آشامل ہوئیں۔ تو پھر کیا اُن کا اور ہمارا فرض اوّلین نہیں کہ جناب مسیحؑ کے مذہب حقہ کو ان باتوں سے پاک کر دیں؟ میں یہ نہیں کہتا، کہ وہ جناب عیسٰیؑ کو چھوڑ دیں، میں یہ بھی نہیں کہتا کہ وہ اپنے گروہ کو چھوڑ کر ہر رنگ میں میرے ہم مشرب ہو جائیں۔ آخر ان پانچ چھ سالوں میں کیا اُن بزرگوں نے جو فلک کلیسا کے درخشندہ ستارے ہیں ان سب باتوں کو خود ترک نہیں کر دیا؟ پھر بھی وہ جناب مسیحؑ کے نام لیوا ہی ہیں۔ عیسائی ہی کہلاتے ہیں۔ عیسوی مذہب ہی کے خادم اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں۔ انگلستانی کلیسا کے معزز سے معزز عہدوں پر

اب تک متمکن ہیں۔ لکھو کھا انسان ان کے زیر اثر ہیں۔ کوئی **بشپ** ہے کوئی ڈین ہے کوئی **ڈیکن** ہے۔ کوئی **آرچ ڈیکن** ہے۔ پھر ان کے علاوہ صدہا گرجوں کے **پاسٹر** ہیں۔ کلیسا کے سب سے بڑے دو ہی عہدے دار ہیں۔ ایک **آرچ بشپ آف یارک** دوسرے **آرچ بشپ آف کنٹربری**۔ اول الذکر نے تو علی الاعلان کہہ دیا ہے کہ کلیسا اس وقت نفرت انگیز ہے۔ جب **آرچ بشپ آف کنٹربری** کی خدمت میں ان باتوں سے گھبرا کر پرانے خیال کے عیسائی عرض کرتے ہیں کہ آپ کچھ فیصلہ کریں تو وہ پہلو تہی کرتے ہیں۔ خود انہوں نے بھی گذشتہ جون میں اپنے ہاں جلسہ کر کے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ لوگ ہاتھ سے نکلے جاتے ہیں، گرجے خالی ہو گئے۔ لوگ سبت کو لہو و لعب کے ذریعے مناتے ہیں۔ آخر یہ کیوں ہے؟ بات ظاہر ہے محققین تو اس نتیجہ پر آچکے ہیں۔ کہ یہ جو کچھ کلیسا میں ہو رہا ہے۔ وہی پرانی **آفتاب پرستی** ہے۔ البتہ وہ ان باتوں کو عام طور پر ظاہر نہیں کرتے انہوں نے اسی اعلان پہ اکتفا کیا ہے کہ عیسائی کلیسا جناب مسیحؑ کا بنا کردہ نہیں۔ عامتہ الناس کو کلیسا کی باتیں پسند نہیں آتیں۔ معاملہ نے طول یہاں تک کھینچا کہ ایک دن ایک دوست نے میرے سامنے سگرٹ کی ڈبیہ کھولی۔ تاجران سگرٹ اپنے نمونوں کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے ڈبیہ میں کوئی نہ کوئی عام دلچسپی

کی چیز ڈال دیتے ہیں۔ اکثر تو ان ڈبیوں میں خوبصورت تصویریں رکھ دیتے ہیں۔ لیکن ایک مشہور فرم اپنی ڈبیہ میں جو کارڈ ڈالتی ہے تصویر کی بجائے اُس میں کوئی نہ کوئی علمی بات لکھی ہوتی ہے۔ یہ ایسٹر کے دن تھے جس وقت یہ ڈبیہ کھولی گئی۔ تو اس میں سے جو کارڈ نکلا اُس پر ایسٹر کی تاریخ تھی۔ آج عیسائی دنیا میں یہ دن بڑی عزّت اور خوشی سے منایا جاتا ہے۔ یہی وہ دن ہے جو مسیحؑ کے موت پر غالب آنے کا دن سمجھا گیا ہے۔ یہی وہ دن ہے جو مسیحی اعتقاد کے بموجب **نئی زندگی** ۔ **نئے عہد**۔ **نئے آدم** کے آنے کا دن ہے۔ بالمقابل یہی وہ دن ہے اور یہی وہ تاریخ ہے اور آفتاب کی ایک نئی کیفیت کا یہی پہلا دن ہے۔ (جس کی تشریح میں آگے چل کر کروں گا) جس وقت زمین مردہ حالت سے نکل کر نئی زندگی اختیار کرتی ہے۔ اس کو ایرانیوں نے **نوروز** کرکے منایا ہے۔ تو ہندوؤں نے اسے **بسنت** کا دن ٹھہرایا ہے۔ اسی طرح مصر اور آئرلینڈ کے لوگ **ایسٹر** کے دن بہار کی دیوی کی پرستش کرتے تھے جس کا نام **آسٹر** تھا۔ لفظ ایسٹر آسٹر سے ہی نکلا ہے ایسٹر کے معنی بہار ہیں۔ پھر اس لفظ کا تعلق مشرق (یعنی سورج کے نکلنے کی جگہ) سے ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ نئے عہد یا موت پر غالب آکر نئی زندگی کے حصول کا دن تمثیلاً روحانی دنیا میں بھی وہی تجویز ہو جیسا جسمانی

دنیا میں زمین زمستانی قبر سے نکل کر اپنے اندر نئی زندگی پاتی ہے اور اس طرح کل عالم کے لیے نئی زندگی لاتی ہے لہذا مسیح خدا نے ایک ڈرامے کے طور پر عالم روحانیات کے متعلق وہی کر دکھایا جو سورج زمین پر کرتا ہے، لیکن مشکل ایک اور آن پڑتی ہے جس کی طرف سگرٹ کی ڈبیہ کا کارڈ اشارہ کرتا ہے۔ ایسٹر کے دن عیسائی احباب آپس میں کچھ تحفے تحائف بھیجتے ہیں۔ اُن تحفوں میں علی العموم **انڈے** اور کراس **کیک** یعنی ایسی روٹی جس پر صلیب کا نشان ہوتا ہے، ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ عیسوی کلیسا کی تعلیم کا خلاصہ ہی صلیب ہے۔ یہی نئے عہد یا نئی **زندگی کا نشان** ہے لیکن کارڈ مذکور میں یہ لکھا تھا کہ **ایسٹر کی تقریب** دراصل بہار کی دیوی کی **تقریب** ہے۔ اُس دن یہی انڈے اور کراس کیک مصر اور آئرلینڈ والے آپس میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ صلیبی کیک کی تشریح تو صلیبی واقعہ سے ہو جاتی ہے۔ لیکن ان انڈوں کی کلیسا کیا تشریح کرے گا۔ کارڈ مذکور نے جو تشریح کی ہے وہ مغربی محققین کی تحقیق سے ہی اخذ کی گئی ہے۔ یہ مسلم ہے کہ ایسٹر کی رسم صرف عیسائیوں سے ہی تعلق نہیں رکھتی۔ بلکہ آفتاب پرستوں نے اسے ہر جگہ ہمیشہ منایا ہے آفتاب کی ایک خاص کیفیت زمین پر بہار کو لاتی ہے۔ بہار اگر زندگی ہے تو خزاں موت ہے اس موت اور زندگی سے انسانی موت وحیات وابستہ ہے۔

انسانی زندگی کا حصر روٹی پر ہے۔ جو زمین ہی کی پیداوار ہے۔ زمین کی شکل انڈے کی واقع ہوئی ہے۔ اس لئے قدیم شماسیوں نے صلیب نما روٹی اور انڈے کو مردہ زمین اور نئی زندگی کا نشان ٹھہرایا ہے۔ اس سے یہ تو پایا گیا۔ کہ انڈے اور روٹی اور صلیب اور اُن کا تعلق مسیحی ایسٹر کے دن سے ہوتا کوئی نئی بات نہیں۔ یہ ایک پُرانی کہانی ہے۔ رہا یہ امر کہ قدیم سے صلیب کا تعلق۔ ایسٹر یا آفتاب سے کیا ہے؟ اسے میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ لیکن یہاں میں عیسائی دوستوں کے غور کے لئے ایک بات عرض کرتا ہوں۔ وہ سوچیں کہ یہ صلیب کا نشان کب کلیسا میں آیا سکندریہ کے راہب **کلیمنٹ** نے جو کتاب عیسائی مذہبی نشانوں پر لکھی ہے، اُس میں **صلیب** نہیں دی گئی۔ اُس میں مسیحؑ کا نشان **مچھلی** ہے۔ چنانچہ زمانہ قسطنطین تک عیسائی قبروں پر صلیب کی جگہ مچھلی کی تصویر ہوتی تھی۔ عبادت گاہوں میں بھی صلیب کی جگہ مچھلی کی شکل ہی نظر آتی تھی۔ راہب **ٹرٹولین** مسیحؑ کو "ہماری ماہی اعظم" کے نام سے پکارتا ہے۔ سینٹ **آگسٹس**۔ سینٹ **جیروم** بھی اس طرح مسیحؑ کو یاد کرتے ہیں۔ مسیحؑ کی خوراک بھی مچھلی ہی نظر آتی ہے۔ دراصل اس کو بھی ایک شمسی کیفیت سے تعلق ہے، جس کا ذکر اپنے موقعہ پر آئے گا۔ ہاں مسیحؑ سے پہلے شماسی دنیا میں ہر جگہ صلیب بطور نشانِ زندگی نظر آتی تھی۔ آج

آئرلینڈ کے کھنڈرات میں ایک صلیب نکلی ہے، اُس پہ ایک شخص پھانسی پہ چڑھا ہوا نظر آتا ہے، اُس کی شکل کے وہ خط وخال نہیں جو یورپین تصور نے مسیحؑ کی تصویر میں دکھلائے ہیں۔ لیکن اُس صلیب پہ چڑھے ہوئے انسان میں ایک اور امر بھی ہے، جو اُسے مسیحؑ سے متمیز کرتا ہے۔ اُس کے سر پہ کانٹوں کا تاج نہیں۔ بلکہ ایرانی تاج ہے اور آفتاب پرستی کو جو ایران سے تعلق ہے وہ ظاہر ہے۔ مسیحؑ کی پیدائش سے بہت پہلے آفتاب پرستی ایران سے چل کر آئرلینڈ پہنچی تھی۔ یہ باتیں اب مان لی گئی ہیں۔ پھر سب سے بڑھ کر ایک طرف تو یہ امر محقق ہو چکا ہے کہ یہ آئرلینڈ کے کھنڈرات دو ہزار برس سے پہلے کے ہیں۔ دوسری طرف چوتھی صدی تک کلیسا کے لٹریچر اور آثار میں صلیب بطور نشان مذہب نظر نہیں آتی۔ اور یہ کون نہیں جانتا کہ نشان صلیب شاہ قسطنطین کی اختراع ہے۔ جو بقول اُس کے اُس نے عالم خواب میں آسمان پر دیکھی۔ میں آگے چل کر یہ دکھاؤں گا کہ صلیب کو آفتاب کی اُس خاص کیفیت سے کیا تعلق ہے، جس کے باعث ظہور موسم بہار اُس تاریخ کو ہوتا ہے جس کے بعد دن بڑھتا ہے۔ لیکن یہ بات ہم بھول نہیں سکتے کہ شاہ قسطنطین سورج پرست تھا۔ اہل روما یعنی اُس کی قوم سب آفتاب پرست تھی۔ اس وقت سورج دیوتا کا نام روما میں اپالو تھا۔ شاہ مذکور کا مربی دیوتا یہی اپالو ہی تھا۔ شمس پرستی سے شاہ مذکور کو اس قدر دلبستگی تھی

کہ اُس کے سکّہ کے ایک طرف تو سورج کی شکل تھی، اور اُس کے دوسری طرف
ذیل کی عبارت ثبت تھی :۔

(DES SOLI INRICTO MITHRA) میں اسے اپنے نہ مغلوب ہونے
والے رفیق سورج کے تام پر معنون کرتا ہوں۔

اگر تو یہ سکہ اُس کے ایّام شمس پرستی تک رہتا تو چنداں مضائقہ
نہ تھا۔ لیکن ستم تو یہ ہے کہ یہ سکّہ اُس کے مرتے دم تک رہا عبارت بالا کے
الفاظ سے ظاہر ہے، کہ تسطنطین کا دل آخری وقت تک مسیح سے نہیں،
بلکہ اپالو اور متھرا یعنی آفتاب سے استمداد کرتا تھا۔ اُس نے اگر خواب میں
اپنے معبود (آفتاب) کو آسمان پر مصلوب ہوتے دیکھا، تو وہ معبود تو ہر سال
گڈ فرائی ڈے یعنی روز ایسٹر سے دو دن پہلے صلیب پر ہوتا ہے جسے
منجم خوب جانتے ہیں اور وہی معبود اس صلیب سے ایسٹر کے دن اُتر کر
دنیا کو نئی زندگی بخشتا ہے۔ آج مصر کے کھنڈرات میں مسیحؑ سے صدیوں پہلے
کی ایک صلیب نکل آئی جو اپنے وقت کی معبود تھی اور عجیب بات یہ ہے
کہ وہ صلیب بھی نئی زندگی کا نشان ہی مانی جاتی تھی۔ یہ وہمی باتیں نہیں،
جس کی خوشی ہو۔ میری طرح سکندریہ کے عجائب خانہ میں جا کر اُس کی زیارت
کر آئے۔ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ وہ صلیب نئی زندگی کا نشان
تھی یا نہیں :۔

شاہ قسطنطین کسی نیک یا مذہبی غرض سے عیسائی نہیں ہوا تھا۔ خود عیسائی محققین نے یہ تسلیم کرلیا ہے، کہ اُس کی تبدیلیٔ مذہب خالصتہً پولیٹیکل اغراض سے تھی، وہ ایک مطلق العنان طبیعت کا انسان تھا۔ اُس کا استبدادی رنگ رومن جمہوریت کے سامنے چل نہیں سکتا تھا، وہ اپنے چچا زاد بھائی کو قتل کرچکا تھا، جس کے قصاص کا خطرہ اپنے معاصرین کی طرف سے اُسے آٹھوں پہر رہتا تھا، رومن لوگ اُس وقت دو گروہوں میں منقسم تھے۔ ایک وہ جو رومن جمہوریت میں اُس کے ہم پلہ تھے۔ یعنی امراء اور اعلےٰ طبقے کے لوگ جو آفتاب پرست تھے۔ دوسرے اُن کے غلام اور خدام وغیرہ جو سب کے سب قریب قریب عیسائی تھے، جو کئی نسلوں سے غلامانہ زندگی بسر کرتے کرتے جی حضوری طبیعت کے ہوچکے تھے۔ اور جن میں استبدادی رنگ آسانی سے چل سکتا تھا۔ مذہب عیسائیت کے اختیار کرنے سے ایک بھاری جماعت تو اُس کے قابو میں آسکتی تھی لیکن شاہی اور قومی مذہب کو بدلنا اور اُس کی جگہ ایک اور مذہب قائم کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ خصوصًا جبکہ خود اُسے اپالو سے اس قدر محبّت تھی۔ اُس کا آسان سے آسان رستہ یہی تھا کہ وہ سورج کے مذہب کو تو ہر رنگ میں قائم رکھے لیکن صرف نام بدل دے اور اپالو کی کرسی پہ جناب مسیحؑ کو بٹھا دے۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا اس طرح ایک طرف اہل روما نے

نے اپنے مذہب میں کچھ ایسی تبدیلی نہ پائی۔ دوسری طرف عیسائی نام پہ ہی خوش ہو گئے۔ وہ بیچارے ادنےٰ سے ادنےٰ حیثیت کے لوگ تھے۔ علم دین سے بھی ناواقف تھے۔ مذہب تو وہی رہا صرف معبود کا نام اپالو کی جگہ مسیح[۲] ہو گیا۔ آخر اپالو بھی تو ہرکیولیز اور ڈایونیسز اور منتھرا کا ایسا ہی قائم مقام تھا۔ یہ بات تو مدت سے یونان و روما میں چلی آتی تھی، روایات مذہبی تو قدیمی قائم رہتی تھیں ہیرو نام بدل جاتا تھا *

لہٰذا اپالو کا جو مندر تھا اُس میں کوئی تبدیلی نہ کی گئی۔ آج اگر اُس کا نقشہ دیکھنا ہو تو رومن کیتھلک کیتھیڈرل کو دیکھ لیا جائے وہی وضع عمارت۔ وہی شکل و صورت اور سب سے بڑھ کر آلٹر یعنی مذبح کا وہی گوشہ مشرق میں ہوتا ہے۔ آج دنیا کا کونسا گرجا ہے۔ جو خواہ کسی فرقہ عیسائیت سے تعلق رکھتا ہو۔ مشرق میں ہو، یا مغرب میں جس کی آلٹر گوشہ مشرق میں نہیں۔ یروشلم سے مغرب کے لوگ اگر آلٹر کا رُخ گوشۂ مشرق کی طرف کر دیتے تو ہرج نہ تھا۔ لیکن یروشلیم یا بیت اللحم یا ناصرہ کے مشرق میں رہنے والے عیسائی کیوں آلٹر کو مشرقی گوشہ میں رکھتے تھے پہلی چند عیسائی صدیوں میں جس قدر گرجے بنتے تھے، اُس میں صرف اسی قدر لحاظ رکھا جاتا تھا کہ ہیکل مغرب مشرق رویہ ہو۔ لیکن مذبح کو بلاتمیز جہت جہاں کہیں بھی ہو بنا دیا جاتا تھا

بلکہ[۵] پلائینس نولانس اپنی کتاب میں ایک گرجے کا ذکر کرتا ہے جس میں مذبح مغرب کی طرف تھا۔ ایسا ہی انطاقیہ کے گرجے بھی اسی وضع کے ہوتے تھے (انطاقیہ وہ مقام ہے جہاں ایک عرصہ بعد پیروان مسیحؑ نے پہلی دفعہ عیسائی نام اپنے لئے تجویز کیا) یہ ایک اتفاقی بات نہیں، بلکہ مشرق کو اُس زمانہ کے عیسائیوں نے ایک خاص اہمیت دے رکھی تھی۔ چنانچہ **سینٹ جیروم** فرماتے ہیں کہ "ہمارے سرائر میں یہ بھی ہے، کہ ہم پہلے اُس سے کنارہ کشی کرتے ہیں جو مغرب میں ہے، پھر مشرق کا رُخ کرتے ہیں" اسی طرح **سینٹ امبروس** کے الفاظ میں ذیل کا فقرہ بھی ہے —

"جب تم بپتسمہ پانے کی جگہ میں داخل ہوتے ہو، اور اپنے دشمن کو دیکھتے ہو، جس سے کنارہ کر کے مشرق کے رخ پھرتے ہو، کیونکہ جو شیطان کو چھوڑتا، وہی مسیحؑ کی طرف آتا ہے۔"

یروشلم کا راہب **سرل** اسی ضمن میں کہتا ہے۔

"مقام بپتسمہ میں داخل ہونے پر تمہیں مغرب رو کھڑا کیا جاتا ہے، جہاں تم شیطان کو ترک کرتے ہو، مغرب ظلمت کی جگہ ہے، گویا مغرب کی طرف رخ کرنا، شیطان کی طرف رخ کر کے اُسے چھوڑتا ہے۔"

---

[۵] کتاب "اَوَرْسن گاڈ"، مصنفہ جے پارتنر صفحہ ۱۶۹--۱۷۰۔

یہ امر صحیح ہے، کہ اگر مسیحؑ کو آفتاب صداقت کہا جائے، تو مغرب مشرق کے الفاظ بطور استعارہ استعمال ہو سکتے ہیں، مگر یہ توجیہ اُسی وقت صحیح ہو سکتی ہے۔ جبکہ شمس پرستی کی اور باتیں کلیسی مذہب میں نہ ہوں۔ لیکن اگر کل کی کل کلیسا کی بنیاد ہی آفتاب پرستی پر ہو، اس کی روایات بھی وہی ہوں، تو پھر ہم اس نتیجہ پر مجبوراً آتے ہیں کہ یہ امر بھی شمس پرستی سے ہی تعلق رکھتا ہے ؛

دوسری طرف جو بات ان شماس طبیعت مسیحیوں نے مسیحی روایات کے خلاف لیکن شماسی روایات کی اتباع میں کی وہ سبت کے دن کی تبدیلی تھی مسیحؑ کے سبت کا دن ہفتے کا دن تھا۔ اُس کے حواری ہفتے کے دن ہی سبت مناتے تھے۔ اور عیسائی دنیا مدتوں اس کی پابند رہی۔ اُس کے مقابل اپالو ہی کا نہیں، ہر جگہ سورج کی پرستش کا دن اتوار تھا، اگر ہندی میں ایت سورج کو کہتے ہیں، تو یورپین زبانوں میں سنڈے جس کے معنی بھی سورج کا دن ہے اور اہل روما اسے SOLI DIES یعنی سورج دیوتا کا دن کہتے تھے۔ عیسائی دوست خود غور کر لیں کہ یہ تبدیلی کیوں ہوئی ؟ اگر عیسائیوں کے لئے مسیحؑ کے قول و فعل ہی واجب الاتباع ہونے چاہئیں تو پھر کس کو حق پہنچتا ہے، خواہ وہ پولوس ہو یا قسطنطین، جو عبادت کے دن کو بدلے۔ رہا یہ کہ مسیح کے دوبارہ

زندہ ہونے کا دن اتوار ہے اس لئے اتوار تجویز کیا گیا، اوّل تو حواریوں نے اور ان کی اتباع میں مدتوں اوروں کے سبت ہفتے کے دن منایا۔ دوسری طرف مسیحؑ کا قبر سے نکلنا بھی دنیا میں کوئی پہلا ہی واقعہ نہیں، بلکہ جیسے میں آگے چل کر بیان کروں گا، مسیحؑ سے پہلے مذہب آفتاب پرستی میں کئی ایسے وجود گزرے ہیں، وہ سب کے سب معبود، اور اپنی اپنی جگہ کے سورج دیوتا تھے۔ وہ سارے کے سارے مسیحؑ کی صلیب کے دن صلیب پر کھینچے گئے، یا صلیب سے ملتی جلتی موت کے ساتھ مارے گئے، اُن کے مصلوب یا مقتول جسم قبر میں رکھے گئے، اُن میں سے بعض مسیحؑ کی طرح دو دن دوزخ میں گئے، اور ایسٹر کی ہی اتوار کو قبروں سے اُٹھے، اس لئے یہ توجیہہ صحیح نہیں معلوم ہوتی، یہ تو اُسی آفتاب پرستی کی رسم کو قائم رکھا گیا ہے چاہئے تو یہ تھا، کہ مسیحی دین کو ہر رنگ میں آفتاب پرستی سے الگ کر لیا جاتا۔ خصوصاً جبکہ مسیحؑ کی چوتھی صدی تک کل کی کل دنیا شمس پرست تھی۔ قربان جاؤں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، آپؐ نے اسلامی نمازوں کو اس شائبہ سے الگ کر دیا، اور حکم دیا کہ سورج کے طلوع، زوال، اور غروب کے وقت کوئی نماز، فرض ہو یا نفل، نہ پڑھی جائے۔

گرجے کے مذبح (الٹر) کا گوشہ مشرق میں ہونا، یا اتوار کے دن

سبت کا منایا جانا، ان دونوں باتوں کو بھی چھوڑ دو، رومن کیتھلک گرجوں میں کم عمر بچوں کا گیت گانے کے لیئے رکھا جانا۔ وہی اپالو کے مندر کا نقشہ ہے۔ ان کے علاوہ **منک** (راہب) اور **نن** (تارکہ) بھی وہی اپالو کے مندر کی صورتیں ہیں۔ ابتدائی صدیوں میں تو نہ راہب نظر آتے ہیں، نہ تارکیں چنانچہ اسی بنا پر کیتھلک فرقہ کے سوا باقی سب فرقوں نے انہیں چھوڑ دیا لیکن اس امر کے متعلق میں ایک فیصلہ کن بات عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ آپ کسی راہب یا تارکہ کی چاند آج بھی دیکھ لیں، یقیناً آفتاب پرستی کی یاد دلائے گی۔ تارکوں کے سر پر اگر بال نہیں، تو اسے زاہدانہ ترک زینت سمجھ لیا جائے، لیکن راہبوں کی چاندیں اور ایسا ہی ہر کیتھلک پادری کی چاند میں بھی ایک گول ٹکیہ ہوتی ہے، جس پر سے بال منڈے ہوتے ہیں، یہ گول ٹکیہ قرص آفتاب کی شکل ہوتی ہے، یہ ٹکیہ کہاں سے پیدا ہوئی اس کو مسیحؑ کی کونسی تعلیم سے تعلق ہے؟ اس کا کوئی صحیح جواب نہیں لیکن جب اس ٹکیہ کو بھی ہم اپالو کے راہبوں کے سر پر پاتے ہیں، تو پھر رومن کیتھلک کے اس سارے کے سارے رنگ کو آفتاب پرستی نہ کہیں تو کیا کہیں۔ اس موقع پر ایک پراٹسٹنٹ کہہ سکتا ہے۔ کہ ہمیں کیتھلک عیسائیوں کی ان باتوں سے تعلق نہیں۔ لیکن اُسے یہ امر بھولنا نہ چاہیئے کہ یورپ میں جب عیسائی مذہب پھیلا تو کیتھلک

شکل میں ہی پھیلا یہ مانا کہ دوسرے فرقوں نے کچھ عرصہ بعد یہ باتیں چھوڑ دیں لیکن اتوار کا دن اور آلٹر تو آج تک وہی ہے، اور اُس کے علاوہ باقی کل کی کل روایات اور معتقدات بھی وہی ہیں۔ چنانچہ اس امر کو اور روشن کرنے کے لئے میں صلیب کے واقع کو لیتا ہوں، اور سردست بابل کی ایک تاریخ کا ورق قارئین کی دلچسپی کے لئے لکھ دیتا ہوں۔ باقی سورج دیوتاؤں کا ذکر اپنے اپنے موقع پر آئے گا۔

بابل کے کھنڈرات تو آئے دن دنیا کو حیران کر رہے ہیں۔ لیکن ۱۹۰۳، ۱۹۰۴ سنہ میں شہر کالانشیر کٹ کے کھنڈرات سے کچھ سلیں برآمد ہوئی ہیں، جن پر حروف کندہ ہیں۔ یہ وہی مقام ہے جہاں قدیمی شہر اسور واقع تھا۔ یہ سلیں کتبخانہ اسور میں سے ہیں، جو مسیحؑ سے نوسو برس پہلے قائم ہوا تھا۔ لیکن یہ کتبے، ان سے بھی بہت قدیمی بابلی کتبات کی نقل ہیں ان کتبات کے مضامین نے مغربی دنیا کو حیران کر دیا یہ توصیح ہے کہ مسیح کے لئے دشمنوں نے صلیب تجویز کی آخر دو قومیں اس کی راوی ہیں لیکن جو داستان صلیب بائیبل پیش کرتی ہے ان کتبات سے مشتبہ ہو جاتی ہے ؛

میں یہاں ان کتبات کی عبارات متعلقہ کو درج کر دیتا ہوں، اور اُس کے مقابل انجیلی داستان کے واقعات درج کر دیتا ہوں البتہ اس موضوع پر مسٹر میڈ کا مفصل اور دلچسپ آرٹیکل جو رسالہ کویسٹ لنڈن کے جنوری نمبر سنہ ۱۹۲۲ء میں چھپا ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے ؛

بابل کی داستان صلیب	انجیل کی داستان صلیب
(١) بعل گرفتار ہوتا ہے	(١) مسیح گرفتار ہوتا ہے
(٢) بعل کا مقدمہ پہاڑی والے گھر (کمرہ عدالت) میں ہوتا ہے	(٢) مسیح کا مقدمہ بڑے ربی کے گھر میں اور پھر پیلاطوس کی عدالت میں ہوتا ہے۔
(٣) بعل کو مارتے ہیں اور زخمی کرتے ہیں	(٣) مسیح کو کوڑے لگائے جاتے ہیں
(٤) بعل کے ساتھ دو مجرم ہوتے ہیں جن میں سے ایک کو سزائے موت دی جاتی ہے اور ایک مجسم کو چھوڑ دیا جاتا ہے (اُس کو بعل کے ساتھ (سزا کے لئے) نہیں لیجاتے	(٤) مسیح کے ساتھ تین مجرم تھے جن میں سے دو کو سزائے موت دی گئی اور ایک مجرم باراباس نام چھوڑ دیا گیا، اور وہ مسیح کے ساتھ نہ گیا۔
(٥) بعل کو پہاڑی کی طرف (مارنے کے لئے) لے گئے۔	(٥) مسیح کو صلیب دینے کے لئے گول گتھا (پہاڑی ٹیلہ)[1] پر لے گئے
(٦) بعل کے پہاڑی کی طرف جانے پر شہر میں شور و فساد شروع ہو گیا	(٦) مسیح کی موت کے بعد ہیکل کا پردہ پھٹ گیا، زلزلہ آیا، چٹانیں پھٹ گئیں، قبریں

[1] اس ٹیلے کو میں نے بھی دیکھا ہے منہ

اور لڑائی ہوئی	شق ہو گئیں، وغیرہ وغیرہ
(۷) بعل کے کپڑے لے لئے گئے	(۷) مسیحؑ کا لباس سپاہیوں میں تقسیم ہوا
(۸) بعل کے جسم میں ایک آلہ کے چبھونے سے جو خون اُس کے دل سے نکلا، اُس کو ایک عورت نے پونچھا۔	(۸) مسیحؑ کے پہلو میں (دل کے قریب) بھالہ کا لگنا خون پانی کا نکلنا پھر عورتوں کا (جسم دھو کر) مشک عطر لگانا۔
(۹) بعل پہاڑی کی تہ میں چلا جاتا ہے، جہاں سورج اور روشنی نہیں، وہ زندگی سے غائب ہو جاتا ہے۔	(۹) مسیحؑ چٹانی قبر میں ڈالا جاتا ہے، اور وہاں سے وہ عالمِ اموات میں چلا جاتا ہے۔
(۱۰) بعل کو پہاڑی قلعے میں بند کر کے اُس پر پہرہ رکھا گیا۔	(۱۰) مسیحؑ کی قبر پر پہرہ رکھا گیا
(۱۱) ایک دیوی بعل کے پاس بیٹھی ہے	(۱۱) مریم مگدلینی اور دوسری مریم میری قبر کے سامنے بیٹھتی ہیں۔
(۱۲) بعل کو جس جگہ رکھا گیا تھا، وہاں اُس کی تلاش کرتے ہیں، خاص کر ایک عورت روتی ہوئی قبرستان کے دروازے پر اُس تلاش کرتی ہے، اور روتے ہوئے کہتی ہے، کہ میرے بھائی! میرے بھائی!!	(۱۲) مریم مگدلینی، قبر پر مسیحؑ کی تلاش میں آتی ہے۔ قبر کو خالی دیکھ کر روتے ہوئے کہتی ہے، کہ میرے خداوند کو لے گئے۔

(۱۳) بعل پھر زندہ ہوتا ہے، اور پہاڑ سے نکلتا ہے،	(۱۳) مسیح زندہ ہو کر قبر سے نکلتا ہے۔
(۱۴) اس واقع کی تقریب پر بابل میں مارچ کے آخری ایّام میں دھوم دھام سے جلسہ ہوتا ہے، خصوصاً اس امر کے لئے کہ اُس دن بعل ظلماتی طاقت پر غالب آیا۔	(۱۴) عیسوی دنیا میں انہی دنوں ایام ایسٹر میں جو خوشی کا تہوار منایا جاتا ہے، اُس کا بھی مقصد یہی ہے کہ مسیح اُس دن ظلماتی طاقت پر غالب آیا۔

اب ایک محقق اگر انجیلی داستان کے واقعات کو بہت حدتک بابلی داستان سے لیا ہوا نہ سمجھے، تو کیا کہے بیس سال سے یہ بابلی کہانی روشنی میں آچکی ہے، فضلائے مسیحیت اسے دیکھ اور سُن چکے ہیں، اس پر کوئی مخالف تنقید نہیں کی گئی۔ بالفرض اگر یہ دو واقعات امر صلیب میں تشابہ ہوتے، تو تاریخ تو بعض واقعات دُہرایا ہی کرتی ہے۔ لیکن یہاں تو تاریخ وہی ہے، قریب قریب کہانی وہی ہے، فرق ہے تو نام اور مقام کا پھر موت، اور موت سے جی اُٹھنے کی غرض ایک ہی ہے یعنی ظلماتی طاقتیں خدا کے نور پر غالب آنا چاہتی ہیں۔

اور کچھ وقت کے لئے اُس پر غالب بھی آجاتی ہیں، حتّٰی کہ وہ مرٹ

جاتا ہے، اور مٹنے کے بعد پھر ظلماتی طاقتوں پر غالب آجاتا ہے ؛

یہ امر محقق ہو چکا ہے، کہ بابل کے لوگ آفتاب پرست تھے، اور **بعل** اُس قوم کا سورج دیوتا تھا۔ وہ لوگ ایام بہار میں ٹھیک اُس دن، جب دن رات برابر ہو کر دن بڑھنے لگتا ہے، یہ رسم ادا کرتے تھے اور یہ سب کچھ تھیٹر کے رنگ میں ہوتا تھا، بخت نصر کے ایام حکومت میں بھی یہ تھیٹر ہوا کرتے تھے، جو یہودیوں کو قید کر کے بابل میں لے گیا تھا، جہاں اسرائیلی اسیر کئی نسل تک غلامانہ حیثیت میں رہے، ان تھیٹروں کو دیکھتے رہے اور واپسی پر ان قصوں کو ساتھ لائے۔ اس واقعہ کے علاوہ توریت اور اسرائیلی شعار میں جو بیسیوں اور باتیں بھی آفتاب پرستی کی شامل ہو گئی ہیں، مغربی تحقیق نے اُن سب کو اسی واقعہ بخت نصر اور قید اسرائیل کی طرف منسوب کیا ہے۔ کتاب پیدائش کے واقعات وغیرہ سب کے سب بابل سے نکل آئے ؛

اب عیسائی دوستو از روئے انصاف آپ خود ہی تبلاؤ، کہ ہم انجیلی واقع پر کیا رائے زنی کریں۔ کاش بابل کے اس سورج دیوتا کے قدیمی مذہب کفر والحاد (پیگین ازم) میں یہی ایک کہانی ہوتی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ظہور مسیحؑ کے وقت، ایران۔ بابل۔ نینوا۔ کارتھیج۔ سیریا۔ یونان۔ روما۔ مصر دیگر یورپین ممالک خصوصاً آئرلینڈ، اور سمندروں پار

میکسیکو سب جگہ آفتاب پرستی ہوتی تھی۔ ہندوستان بھی اس سے خالی نہ تھا۔ ان سب ممالک میں اپنے اپنے ہاں ایک نہ ایک سورج دیوتا تھا۔ ان کے نام جیسے میں پہلے لکھ چکا ہوں حسب ذیل تھے۔

متھرا (ایران) **بعل** (بابل) **اطیس** (فریجیا سیریا) **اسٹارٹی** (کارتھیج سیریا) **ایڈونس** (سیریا) **بیکس** (یونان و روما) **ہرکیولیس** (یونان و روم) **ہورس** (مصر) **ادسیرس** (مصر) **کیٹزل کوٹل** (میکسیکو) **اپالو** (روما) پھر یہ کہ ان میں سے اکثر باکرہ کے ہی پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں۔ تاریخ ولادت بھی ان میں سے اکثر کی وہی ۲۵ سے لے کر ۲۸۔ دسمبر تک کی ہے، جیسے سورج کی ایک خاص کیفیت سے تعلق ہے (جس کو میں آگے چل کر بیان کروں گا) پھر سب سے بڑھ کر اس بات کو ہم کیا کریں، کہ ان میں سے بعض کی موت بھی

لہ نسل انسانی کو مصیبت اور گناہ کی سزا سے بچانے کے لئے خدا یا خدا کے بیٹے کا انسانی شکل اختیار کرنا اور اپنی قربانی سے نسل انسانی کو نجات دینا ایک عام عقیدہ مسیح سے پہلے ہر جگہ موجود تھا خصوصًا ان مذاہب میں جسے آج عیسائی پیگنزم (PAGANISM) کہتے ہیں۔ اطیس درخت سے بندھا ہوا اور اس کے جسم میں میخیں چبھی نظر آتی ہیں۔ درخت کے نیچے ایک بچھڑا دکھایا جاتا ہے (ڈیوپیں صفحہ ۲۵۵) ایڈونس کی موت کے مختلف بیان دیئے گئے ہیں لیکن ایک مجسمہ میں وہ بطور مصلوب نجات دہندہ دکھلایا گیا ہے اس کی موت کی یاد میں جو دن منایا جاتا تھا۔ اس میں ایک مجسمہ کو کفن میں لٹا کر روتے پیٹتے تھے اور وہی

باقی صفحہ ۸۲ پر ملاحظہ فرمائیں۔

مسیحؑ کی موت سے ملتی جلتی ہے۔ ان سب کے متعلق بھی یہی عقیدہ ہے، کہ وہ نسل انسانی کی نجات کے لئے مرے، وہ سب کے سب اپنے پرستاروں میں نسل انسانی کے **نجات دہندہ** اور **شفیع** کہلائے مسیحؑ کی طرح نسل انسانی کی تعلیم کے لئے اکثر سفر میں رہے (خود لفظ مسیحؑ کے ایک معنی بہت سفر

(نوٹ)
(بقیہ صفحہ ۸۱) باتیں کرتے تھے جو آج رومن کیتھلک گڈ فرائیڈے کے دن کرتے ہیں۔ پرومتھیئس نسل انسانی کے لئے کوہ قاف کے دامن میں پہاڑ سے باندھا جاتا ہے ناراض شدہ خدا کے کارکن اس کے ہاتھ پاؤں میں کیلیں ٹھونکتے ہیں وہاں وہ صلیب کی طرح ہاتھ پھیلائے نظر آتا ہے اور کہتا ہے "اس کی مرضی کے خلاف مجھے کوئی نہیں بچا سکتا" (اسکائیلس) بیکس ابن جیوپیٹر (خدا) بھی انسانوں کی نجات کیلئے مقتول ہوتا ہے۔ سراپنیر مصر کے ابن اللہ کے مندر کے کھنڈرات میں ایک صلیب پائی گئی ہے۔ اسیریس قتل ہوتا ہے اور اسکے اعضاء وجوارح الگ کئے جاتے ہیں فی الجملہ دیوتاؤں کا نسل انسانی کیلئے مصلوب ہونا اور صلیب کا نشان نجات ٹھہرانا مسیح کے وقت اور اس کے بعد دو تین صدیوں تک ایسا عام تھا کہ راہب مینوسیس فلپ اپنی کتاب اوکٹوییس میں بیگن لوگوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ "ہم لوگ تو صلیب کے پرستار نہیں، یہ تو تم اسکی پرستش کرتے ہو تمہارے علموں، جھنڈوں اور ہر ایک بات پر صلیب کا نشان ہے" خود ٹرٹولین نے بھی اس امر کو تسلیم کیا ہے وہ یلوجیا میں بیگن کو مخاطب کر کے لکھتا ہے کہ "تمہارے سب کے سب خدا تو وہی تصویریں ہیں، جو صلیبوں پر نظر آتی ہیں تمہارے سب علموں پر صلیبیں یا مصلوبوں کی شکلیں ہیں" کنٹرل کوٹل تصویریں بھی مصلوب ہی نظر آتی ہیں۔ اور وہ موت نسل انسانی کے گناہ کے کفارہ میں مانی جاتی ہے۔ (کنگز بارڈ صفحہ ۱۶۶-۱۶۷)

کرنے والا بھی ہیں) اُن کی ولادت بھی غار یا کسی تہ خانہ میں ہوئی، اُن پر ظلمانی قوتیں غالب آئیں، وہ مرے، دوزخ یا تحت الثراء میں اُترے، مردوں میں سے جی اُٹھے، وہ اپنی جماعت میں مریدوں کو بپتسمہ کے ذریعہ داخل کرتے تھے، اُن میں سے بعض کے شاگرد بھی بارہ ہی تھے اُن کی یاد میں ایک قسم کی عشاء ربانی بھی ہوتی تھی، ان مشابہتوں کے علاوہ بہت سے کیتھلک تہوار، اور اُن تہواروں کی تاریخیں بھی وہی ہیں، جو اُن قدیمی مذاہب میں پہلے سے موجود تھیں مثلاً جناب مریمؑ کے طہر کی تاریخ، اور اُس میں مومی شمعوں کا آنا، معراج مریم، مریم کی پیدائش کی تاریخ۔ اب یہاں میں چند سورج دیوتاؤں کا ذکر کر دیتا ہوں۔

منتھرا ایک غار میں ۲۵ دسمبر کو کنواری کے پیٹ سے پیدا ہُوا، اُس کے بارہ شاگرد تھے، وہ انسانوں کی تعلیم کے لئے جگہ بہ جگہ جاتا تھا قبر میں دفن ہُوا، اور قبر سے نکلا، اُس کے جی اُٹھنے پہ خوشیاں منائی گئیں، اُس کی یاد میں دو تہوار منائے جاتے تھے، ایک شروع جنوری سے آٹھ دن پہلے، اور دوسرا اخیر مارچ (وہی کرسمس اور ایسٹر ہیں) اُس کے پیرو ضیافت **عشائے ربّانی** میں بھی شریک ہوتے تھے، اُسے **منجی** اور **شفیع** کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، اور **بعض وقت اُس کی شکل بچھڑے کی بنائی جاتی تھی**۔ یہ کوئی حیرت کا مقام نہیں۔ یہ ساری کی ساری باتیں

حتیٰ کہ بچھڑہ کی شکل بھی، سورج کی مختلف کیفیات سے تعلق رکھتی ہیں یہ بھی یاد رہے، کہ تیسری چوتھی صدی عیسوی میں منتھرا ہی کی پرستش سب جگہ غالب آگئی تھی۔ روم کا اپالو بھی منتھرا کا ہی اُتار یا قائم مقام تھا۔ آئرلینڈ کے کھنڈرات میں جو صلیب پر چڑھے ہوئے کے سر پر ایرانی تاج نکلا ہے، وہ بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ کیونکہ منتھرا کے نام پر سورج پرستی ایران سے ہی نکلی (ملاحظہ ہو پیگن کرائسٹس صفحہ ۳۳۸ مصنفہ رابرٹسن۔ ڈرمٹا گاگ مصنفہ نارک مطبوعہ پیزگ پیگن اینڈ کرسچن کریڈس صفحہ ۲۱ مصنفہ اڈورڈ کارپنٹر) اسپرس ۲۷۔ دسمبر کو باکرہ نیتھ کے پیٹ سے مصر میں پیدا ہوا جس کی پیدائش پر ایک (آسمانی) آواز نے اعلان کیا، کہ یہ سب کا خداوند ہے، مسیح کے متعلق بھی اسی قسم کی آواز کا ذکر انجیل میں ہے) اُس نے تلوار کے ذریعہ نہیں بلکہ محبت اور ملائمت سے (مسیح کی طرح) لوگوں کی اصلاح کی، غلہ اور شراب اُسی کی ایجاد کردہ ہیں۔ مسیح کا پہلا معجزہ بھی شراب ہی بنانا ہے۔ اُسے ٹائفن نے (یہودہ اسقریوطی کی طرح) پکڑوایا، وہ قتل ہوا، اُس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے، اُس کی نعش کو صندوق میں رکھا گیا، اور موت سے دو دن کے بعد پھر زندہ ہوا، جس طرح چھٹی ساتویں صدی عیسوی میں مسیح کی تکالیف، اُن کی موت اور جی اُٹھنے کو ناٹک کے رنگ میں ہر برس دکھلایا جاتا تھا۔ اسی طرح شہر ابیڈوس میں بھی اسی قسم کے ناٹک

ہر سال ہوتے تھے۔ مصر کا دوسرا سورج دیوتا **ہورس** نام آئی سس باکرہ کے پیٹ سے ۲۸۔ دسمبر کو پیدا ہوا (کتاب آئی سس اسیرس مصنفہ پلوٹارک) اُس کی اور روایات کو چھوڑ کر میں ایک خاص واقع کا ذکر کرتا ہوں جس نے مسیحی دنیا میں عظیم الشان اہمیت حاصل کی ہوئی ہے۔ یہ جو تصویروں میں اور کیتھلک گرجوں میں عام طور پہ مریم عذرا کی گود میں ایک آسمانی بچہ (مسیحؑ) نظر آتا ہے یہ کہاں سے عیسائی مذہب میں داخل ہوا۔ پہلی تین چار صدیوں میں تو یہ کہیں نظر نہیں آتا۔ اس کی بنیاد سکندریہ کے کلیسا نے غالباً پانچویں صدی میں قایم کی تھی، جہاں صدیوں پہلے شماسی مندروں میں کنواری **آئیس** آسمانی بچے ہورس کو لیے ہوئے پوجی جاتی تھی۔ اس کے مندر کل مصر میں تھے۔ قدیمی راہبوں نے عیسائی مذہب کو شماسی دنیا میں ہر دل عزیز بنانے کے لئے جہاں سورج دیوتا کی اور روایات مسیحؑ کے متعلق قبول کر لیں، وہاں یہ بھی ضروری سمجھا، کہ باکرہ **آئیس** اور **ہورس** کے مندر کے مقابل باکرہ مریم اور بچہ (مسیحؑ) کے مندر بھی قائم ہوں۔ پھر مندروں کے بنانے تک ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ سورج پرستوں کو یہ یقین دلانے کے لئے، کہ یہ نیا مذہب دراصل اُنہیں کا مذہب ہے اور مریم اور مسیحؑ وہی **آئیس** اور **ہورس** ہیں عیسائی آئیس کے مندر میں جاتے، اُس زمانہ کے عام مسیحی چھوڑ بشپوں تک اُسی طرح آئی سس اور ہورس

کے آگے سرِ نیاز جھکاتے، جیسے مریم اور مسیحؑ کے آگے وہ جھکتے تھے۔ اِس طریق عمل نے یہاں تک اثر کیا، کہ عام طور پر آئی سس اور ہورس پرست بھی مریم کے مندر میں جانے لگے، جس طرح کہ عیسائی آئی سس کے مندر میں جاتے تھے۔ چنانچہ قسطنطین کے باپ شہنشاہ ہیڈرین نے ایک چٹھی میں جو اُس نے سرویناس کو لکھی۔ اہلِ سکندریہ کا ذکر کرتے ہوئے ذیل کا فقرہ لکھا ہے " جو لوگ پرستارانِ سیراپیس (سورج دیوتا) ہیں، وہ عیسائیوں کی طرح ہیں۔ بالمقابل جو مسیحؑ کے بشپ کہلاتے ہیں، وہ سیراپیس کے پرستار ہیں"۔ پیرس میں جو نوٹرڈام کا بڑا گرجا ہے اُس کے متعلق ایڈورڈ کارپینٹر اپنی جدید تصنیف پیگن اینڈ کرسچن کریڈ کے صفحہ ۳۳ میں لکھتے ہیں کہ " گرجا دراصل آئی سس کا ہی مندر سمجھا جاتا ہے"۔

ہورس کو لئے ہوئے آئی سس کا بت، اور اس کے مقابل مریم اور اُس کی گود میں مسیحؑ کا بت، ابتدائی سنگ تراشوں نے ایک ہی وضع پر تراشا ہے، میں نے سکندریہ کے عجائب خانہ میں اِن دونوں کو دیکھا ہے مصر کے پرانے کھنڈرات نے اس مضمون پر اور بھی روشنی ڈالی ہے۔ ڈنڈیرا کے مندر کے گنبد کے اندر کی طرف چھت پر ایک نقشہ بارہ برجوں کا دیا گیا ہے، جہاں برج سنبلہ کی تصویر حسبِ معمول ایک عورت کی دی

گئی ہے لیکن اُس کے کنارے پر سنبلہ کے مقابل ایک اور تصویر ہورس کو لئے ہوئے آئی سس کی ہے، یہ تصویر مریم اور اُس کی گود میں مسیحؑ کی تصویر کی سی ہے۔ نقشہ بروج میں، سنبلہ کے ساتھ ہی ایک کنواری اور بچے کو دکھلانا، کتب نجوم میں یہانتک دائرو سائر تھا۔ کہ ابن ذر عربی منجم، اور ابو ذر فارسی منجم نے، جو کہ روی نقشے بروج کے دیئے ہیں، وہاں بھی سنبلہ کے مقابل ایک کنواری بچہ لئے کھڑی دکھائی ہے۔ اب مریم کی گود میں مسیحؑ کا بت سب سے پہلے سکندریہ میں بنایا جانا، جہاں آئی سس اور ہورس کا بت پہلے ہی موجود تھا۔ اُس وقت کے اہل مصر کا شمس پرست ہونا نجومی نقشوں میں سنبلہ کے ساتھ کنواری کا بچے کو گود میں لئے کھڑی ہونا۔ ان سب باتوں پر غور کرنے سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ ظاہر ہے ایڈو نس۔ ایڈونس سیریا کا دیوتا بھی کنواری کے بطن سے پیدا ہوا۔ وہ بھی ٹائفن کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ کنواریں اُس کے لئے بھی روتی ہیں، جیسے کہ کتاب حزقیل باب آیت ۱۴ میں اشارہ کیا گیا ہے وہ بھی موسم بہار میں دوبارہ زندہ ہوتا ہے۔ اطلس دیوتا کی کہانی بھی اس قسم کی ہے۔ وہ بھی باکرہ بی بی نانا کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے چنار کے درخت کے ساتھ باندھ کر وہ قتل کیا جاتا ہے، پھر زندہ ہوتا ہے۔ اُس کے خون سے ہی دنیا میں سرسبزی ہوتی ہے، ہرکلیس یونان اور روم کا سورج دیوتا بھی

اسی طریق پر آسمانی باپ کے حمل سے پیدا ہوتا ہے۔ اُس کے بارہ دوست تو نہیں ہوتے، البتہ اُس کے بارہ بڑے کام ہیں۔ اُن میں سے دوزخ میں جانا، موت پر غالب آنا، اور پھر دوزخ سے نکل کر آسمان کی طرف چڑھ جانا بڑے کام ہیں۔ کیا یہ تینوں باتیں آج ہم جناب مسیحؑ کے متعلق نہیں سنتے ۔

یہ سورج دیوتا قریب قریب انہی ممالک کے ہیں جو ایک دوسرے سے متصل واقع ہوئے ہیں اور یقیناً ایران سے چل کر **بابل** ۔ کارتھیج ۔ سیریا، پھر سیریا سے چل کر ایک طرف **یونان** اور یونان سے **روما** اور وہاں سے **آئرلینڈ** اور دوسری طرف سیریا سے **یہودہ** اور **فلسطین** اور فلسطین سے مصر غرض سب جگہ یہ مذہب پہنچ گیا ہے، اسی لئے تو **متھرا پرستی** کو ہم ہر جگہ غالب پاتے ہیں، آئرلینڈ کے برآمدہ مصلوب معبود کے سر پر ایرانی تاج ہے، لیکن جس امر نے یورپین محققین کو حیران کر رکھا ہے، وہ یہ ہے کہ **میکسیکو** اور **گولاٹی مالا** وغیرہ کا مذہب بھی وہی روایات اور وہی عقائد اپنے اندر لئے ہوئے ہے جو ہر جگہ پیگن ازم میں موجود ہیں، سب سے پہلے پہلا پادری دکوٹس، جو **میکسیکو** میں پہنچا، اُس نے اپنا ہی مذہب ہو بہو وہاں پہلے سے موجود پایا۔ اور اپنی حیرت کو اُس نے اُسی تشریح کے ذریعہ دور کیا، جو ناوس سے چند صدیاں پہلے **جسٹن شہید** اور دیگر راہبوں کے خیال میں آئیں۔ جب انہوں نے اپنے ہی مذہب کی روایات و حکایات کو

متھرا پرستی میں موجود پایا۔ ان سب داستانوں میں متھرا کی طرح میکسیکو کے خدا کوئٹزل کوٹل کی داستان، داستان مسیح سے بہت ہی ملتی جلتی ہے میکسیکو میں ایک عفیفہ باکرہ چملمن نام تھی۔ اُسے بھی فرشتے نے ہی اطلاع دی، کہ وہ بکرہ ہی میں بچہ کی ماں ہو گی۔ چنانچہ اس آسمانی اطلاع کے بعد ہی وہ حاملہ ہو گئی۔ ایام مقررہ کے بعد بچہ پیدا ہوا، جس کا نام کوئٹزل کوٹل رکھا گیا جس کے معنی ہیں ہمارا پیارا بیٹا اُس نے بھی چالیس دن روزہ رکھا وہ بھی آزمائش میں پڑا، وہ بھی مارا گیا، وہ بھی پھر جی اُٹھا۔ اُس کی بھی آمد ثانی کا انتظار کیا گیا۔ حتیٰ کہ جب پادری کورٹس وہاں پہنچا، تو اُن سادہ لوحوں نے پادری صاحب کو سرخ وسفید پا کر سمجھا کہ ہمارا خدا (کوئٹزل کوٹل) ہی واپس آگیا ہے۔ پھر مریم کی طرح چملمن کو بھی، دوشیزہ ملکہ جنت کہتے تھے۔ آج اگر جناب مریم کو عیسائی دنیا اَور لیڈی (یعنی ہماری خاتون) کہتے ہیں تو کنواری آئی سِس کو بھی مصری لوگ اور لیڈی (یعنی ہماری خاتون) ہی کہتے تھے (اور میکسیکن انٹی کوئٹیز جلد ۲ صفحہ ۱۷۶ مصنفہ کنگز بارون)

بیکس یا ڈایونائی سِس کا بھی یہی قصہ ہے، وہ بھی اُسی تاریخ کو کنواری سِملی کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے، وہ بھی نسل انسانی کو نجات دینے کے لئے ہی مرتا ہے[1]۔ الغرض ان سب داستانوں میں تاریخ ولادت،

(۱) دیکھو صفحہ ۱۱۳ (۱۱۴)

دلادتگاہ، کنواری کا حمل، نسل انسانی کی نجات کے لئے اِن کا مرنا، موت کا صلیب پر، یا درخت کے ساتھ بندھ کر، یا خون کے نکالے جانے یا قتل کے ذریعہ واقعہ ہونا، مگر اکثر حالتوں میں دو دن کے بعد جی اُٹھنا، اِن دو دنوں میں دوزخ یا تحت الثریٰ یا عالم اموات میں جانا، اُن کے جی اُٹھنے کے دن کا روز عید بننا، ان سب کا شفیع، نجات دہندہ، روشنی عالم، پہلوٹھا بیٹا۔ اکلوتا وغیرہ وغیرہ کے نام سے موسوم ہونا ہر جگہ ایک ہی۔ دوسری طرف انجیل میں ہی یہی باتیں ہم دیکھتے ہیں ؎

یہ باتیں بالضرور آج مٹ گئی ہیں، گو کتابیں، اور کھنڈرات اور پُرانے کتبے، ان کی تصدیق میں موجود ہیں۔ جو یورپین محققین کے نزدیک مسلم ہیں، لیکن اگر کوئی زبردستی شک کرنا چاہے تو کرسکتا ہے کیونکہ جب مسیحیت نے یورپ میں طاقت پائی تو ان آثار قدیمہ کو تلوار کے ذریعے مٹا دیا گیا، ان مذاہب کے معلمین کو قتل کیا گیا ہائی پیشیا کے خون کے لئے جو اسکندریہ میں مذہب شناسی کی ایک زبردست فاضل معلمہ تھی، آج بھی تاریخ کے اوراق اسکندریہ کے بشپ کو متہم کر رہے ہیں جس نے ایک پادری کے ہاتھ سے اس فاضلہ کو سنہ ۴۱۵ء میں قتل کرایا۔ اسی بشپ سے پہلے سکندریہ کے بشپ نے سنہ ۳۹۰ء میں پرانے مذاہب کا فلسفہ اور علوم مٹانے کے لئے، شہنشاہ تھی اوڈوسیس سے اجازت

لے کر، سکندریہ کا کتبخانہ جلا دیا۔ جس کا الزام تیرھویں صدی میں بشپ ابو الفراجیس کے ذریعے حضرت خلیفہ ثانی کے ذمہ لگایا گیا۔[1] الغرض یہ آثار تو آج مٹ گئے لیکن چھٹی ساتویں صدی تک یہ باتیں عیسائی مذہب کے دوش بدوش موجود تھیں جو کچھ عیسائی مذہب میں ہو رہا تھا (اور وہ وہی ہے جو آج ہے) وہی اُس وقت سورج پرستوں میں موجود تھا اور یہ دو تین صدی سے چلا آ رہا تھا۔ جن راہبوں نے ان باتوں کو عیسائی مذہب میں داخل کیا تھا، وہ بھی عرصہ سے مر چکے تھے۔ اس لئے مذہب شماسی اور مذہب عیسائی کا یہ تقابل اور تشابہ لوگوں کی حیرت کا موجب ہوا۔ اس وقت کے متشککین کے اطمینان کے لئے ضروری تھا، کہ وقت کا کلیسا ان باتوں کی تشریح کرے۔ تاریخ کلیسا میں جسٹن شہید، سینٹ آگسٹس، سینٹ جیروم، سینٹ ٹرٹولین، بڑے پایہ کے راہب مانے گئے ہیں اُن کی تحریروں میں ہم ذیل کی باتیں پاتے ہیں سینٹ ٹرٹولین لکھتے ہیں" شیطان کا تو کام ہی صداقت کو روکنا ہے، چنانچہ عشاء ربانی کی ہوبہو نقل وہ اپنے بتوں کے متعلق کراتا ہے، وہ اپنے پیروں کو بپتسمہ بھی دیتا ہے، اُن سے وعدہ کرتا ہے۔

---

[1] حالانکہ تیرھویں صدی عیسوی کے پہلے کی ایک تاریخ بھی اس قابلِ نفرت افترا و بہتان سے متعلق نہیں ۱۲ برق گنجوی

کہ مقدس حوض (جس کے پانی سے بپتسمہ دیا جاتا ہے) سے ہی اُنہیں گناہ کی معافی ملے گی، بپتسمہ کے ذریعہ وہ اُنہیں مذہب منتھرا میں داخل کرتا ہے، اسی طرح اُن کی پیشانی پر نشان کرتا ہے، روٹی کی تقدیس بھی کرتا ہے، دوبارہ جی اُٹھنے کا بھی ایک نشان قائم کرتا ہے، یعنی اپنے پرستاروں کو پانی سے بپتسمہ دے کر اُنہیں گناہوں سے پاک کرتا ہے وہ حکم دیتا ہے کہ اُس کے بڑے پادری تو ایک شادی کریں، لیکن اُس کے ہاں کنواریاں بھی ہیں اور راہب بھی ہیں،" جسٹن مارٹن فرماتے ہیں رسولوں نے جو تفسیریں لکھیں، جنہیں ہم انجیل کہتے ہیں، اور وہ ہم تک پہنچی ہیں، ان میں مسیحؑ رسولوں کو حکم دیتا ہے۔ "پھر اُس نے (مسیح نے) روٹی لی، اور خدا کا شکر کیا، اور کہا کہ اس بات کو میری یاد میں کرتے رہنا یہ میرا جسم ہے۔ پھر اُس نے پیالہ لیا، اور شکر ادا کیا اور کہا، کہ یہ میرا خون ہے، اور پیالہ اُن کو دیا" یہ ساری باتیں خبیث روحوں نے منتھرا کے پرستاروں کو سکھا دی ہیں، اور منتھرا کی یاد میں اور اُس کی پرستش میں ہو رہی ہیں پھر مسیحؑ کی پیدائش کا جو طویلے میں ہوئی، حوالہ دیتے ہوئے یہی راہب لکھتا ہے، کہ" بیشک مسیح کی پیدائش اُسی دن ہوئی جس دن طویلہ او جین میں سورج پیدا ہوا بلکہ مسیحؑ کی پیدائش جو طویلہ میں ہوئی، تو یہ دراصل منتھرا کی پیدائش کا نمونہ ہے، جو زرتشتی غار میں ہوئی"

سینٹ اگسٹس کسی قدر فخر کے ساتھ فرماتے ہیں کہ "ہم کرسمس کے دن کو کفار کی طرح نہیں مناتے، جو اُن کے ہاں کی پیدائش کا دن ہے، بلکہ ہم تو اس دن کو اس لئے مناتے ہیں، کہ اُس دن سورج کا پیدا کرنے والا پیدا ہوا۔"

اِن راہبوں کی یہ باتیں واقعی بزرگانہ ہیں۔ اپنے وقت کی ضرورت کو وہ خوب سمجھتے تھے، ہمیں اس سے غرض نہیں کہ شیطان کس طرح پہلے ہی سے ارادہ خداوندی سے واقف ہو گیا، اور اُس نے صدیوں پہلے سورج پرستی کی روایات اور عقائد میں وہی باتیں داخل کر دیں، جو نہ مسیح نے، نہ اُس کے بعد تین صدیوں میں، بلکہ چوتھی صدی میں جب مسیحیت اور شمس پرستی کا تصادم ہوا، عیسائی مذہب میں آ داخل ہوئیں، بہر حال یہ امر تو فیصل ہو گیا، کہ سورج پرستی میں بپتسمہ کے ذریعہ ہی لوگ داخل ہوتے تھے۔ اُن کے مندروں میں بھی مقدس حوض ہوتا تھا، جس کے پانی سے پیشانی پر بپتسمہ دیا جاتا تھا بپتسمہ گناہ سے پاک ہونے کا نشان تھا۔ اُن کے ہاں بھی متھرا کی یاد میں عشاءِ ربانی کی رسم ہوتی تھی، روٹی کی تقدیس ہوتی تھی۔ مسیح کی پیدائش کی تاریخ نہ صرف متھرا یا سورج کی پیدائش کا ہی دن ہے، بلکہ آپ کی ولادت گاہ یعنی طویلہ بھی کسی پرانے طویلے کی یاد ہے۔"

یہ باتیں تو مقدس راہبوں کی مقبولہ ہیں۔ یہ تو صحیح ہے کہ مسیحؑ کسی نہ کسی تاریخ کو پیدا ہوا ہو گا، لیکن اس کتاب کا کیا ثبوت ہے، کہ وہ ۲۵ دسمبر

کو پیدا ہوا کینن فیرر نے اپنی کتاب حیات مسیح میں اس امر کو تسلیم کیا ہے، کہ مسیح کی تاریخ ولادت کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ اور یہ سچ بھی ہے۔ انجیل میں کہیں اس امر کا ذکر نہیں صرف اس قدر بات معلوم ہوتی ہے، کہ اُس رات گڈریئے بھیڑوں کو لیئے ہوئے بیت اللحم کے کھیتوں میں موجود تھے۔ لیکن انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں کرسمس ڈے کے آرٹیکل پر لکھنے والے نے اس امر پر ایک نہایت عمدہ تنقید کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دسمبر کا مہینہ تو ملک یہودیہ میں سخت بارش کا مہینہ ہے، اُن دنوں میں کس طرح بھیڑیں یا گڈریئے کھلے آسمان تلے رہ سکتے ہیں۔ اس کے مقابل چار صدیوں تک ۲۵۔ دسمبر تاریخ ولادت مسیحؑ نہیں سمجھی جاتی تھی۔ سنہ ۵۳۰ء میں سینتھیا کا ایک راہب ڈائی نیس ایکسیگز نام، جو منجم بھی تھا، تاریخ ولادت مسیح کی تحقیق اور تعین کے لئے مقرر ہوا، انجیل کے سوا دنیا کی اُس وقت کی کسی کتاب میں مسیح کا ذکر نہ تھا، انجیل خود اس معاملہ میں خاموش تھی، مسیح سے پانچ چھ صدی پہلے سے ہی ۲۵۔ دسمبر ایک مقدس تاریخ تھی۔ بہت سے سورج دیوتا اسی تاریخ پر یا اس سے ایک آدھ دن بعد پیدا ہو چکے تھے پھر اس سے بہتر اور کیا تاریخ ہو سکتی تھی۔ اب عیسائی دوست ان واقعات پر غور کریں اُن کے ہاں دو ہی بڑے تہوار ہیں۔ ایک کرسمس دوسرا ایسٹر ان تہواروں کے متعلق جو کچھ بھی وہ جناب مسیحؑ کے متعلق

مانتے ہیں، وہ سب کی سب قبل از مسیحؑ آفتاب پرستی میں موجود ہیں بپتسمہ اور عشاء ربانی بھی پہلے سے موجود ہیں۔ خدا کا پیدا ہونا، نسل انسانی کو اپنے خون سے نجات دینا، انسان اور خدا میں شفیع بنتا قریباً سارے کا سارا صلیب اور مقدسہ مسیح کا واقعہ اور اس کے کوائف الغرض کونسی بات ہے، جو پیگن ازم میں موجود نہیں۔ وہی تعلیم اور فلسفہ کلیساء جس کی بنیاد انجیل یوحنا کے پہلے باب میں ہے۔ یعنی مسئلہ کلام وہ پولوس کی تجویز شدہ ہے۔ اُس کو بھی مسیح سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ کہاں سے آئی؟ اُس کا ماخذ بھی مسیح سے پہلے موجود ہے۔ حتیٰ کہ وہ اصطلاحیں بھی جو پولوس اور کلیسا کی تحریریں استعمال کرتی ہیں، وہ بھی پہلے کی ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ اور جو تہوار آج کیتھلک فرقہ مناتا ہے، وہ بھی سب کے سب پہلے سے ہی موجود تھے۔

رہا یہ امر کہ سورج دیوتاؤں کا ۲۵ر دسمبر یا اُس سے ایک دو دن بعد بطن باکرہ سے ہر جگہ پیدا ہونا۔ سورج دیوتوں کا مرکر ایام ایسٹر میں ہی دوبارہ زندہ ہوتا، اور ایسی ہی اور بہت سی باتیں کس طرح دنیا میں پیدا ہوگئیں، یا یہ روایات ایک ہی خط و خال میں کیوں مختلف ممالک میں دائر و سائر ہوگئیں حالانکہ اُن میں میکسیکو بھی ہے، جو دیگر ممالک سے کئی سمندر پار ہے۔ اس پہ یورپین مصنفین نے حیرت بھی ظاہر

کی ہے۔ لیکن یہ سب کی سب باتیں ذیل کے امور مدِ نظر رکھنے سے حل ہو جاتی ہیں
عالم حیوانات میں انسان ہی وہ ذی روح وجود ہے، جو اپنے سے بڑی ہستی
کا طبعًا پرستار ہے۔ نفع و نقصان یا راحت و تکلیف، حس کا پیش از
وقت احساس بھی ادراک انسانی تک ہی مختص ہے، یہ دونوں باتیں اُس کی
گردن اُن کے آگے جھکا دیتی ہیں جن سے اُسے نفع کی اُمید یا نقصان
کا خطرہ ہو۔ بت پرستی کی کل روایات کو دیکھ لیا جائے۔ اُن سب کی
تہ میں یہی دو باتیں ہیں **سرستی دیوی** اور **کالی مائی** کی پرستش بھی
نفع و نقصان ہی کے جھگڑے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے
جو چیزیں انسان کی سرسری نگاہ نے نفع اور راحت کا باعث دیکھیں۔
وہی ایسے وقتوں میں جب کہ الہام آلٰہی انسانی ہاتھوں سے مغشوش
ہو گیا۔ انسان کا رب اور خدا بن گئیں۔ بالمقابل وہ وجود یا وہ واقعات
جو مخل نفع و راحت ہوئے۔ وہی شیطان اور اُن کے خداؤں کے دشمن
کہلائے۔ بعض گردنیں اُن کے آگے بھی جھک گئیں۔ اب اگر ان تمام
چیزوں کو خدا کی مخلوق نہ مانا جائے اور مظاہر قدرت کو ہی مختلف خدا
اور گروہ شیاطین مان لیا جائے، جیسے کہ اسلام سے پہلے کل مذاہب
باطلہ نے مانا۔ تو ان سب مذاہب قدرت میں اگر کوئی وجود ربّ بلکہ
رب الارباب کہلانے کا مستحق ہے تو وہی نیرّ اعظم آفتاب ہے ہم نظام شمسی سے

تعلق رکھتے تھے۔ اگر اسلامی عقیدے کو ایک طرف رکھ لیا جائے تو پھر آفتاب ہی سب چیزوں کا خالق اور مالک ہے۔ خود ہماری زمین اسی میں سے نکلی ہے جو کچھ زمین میں ہے وہ بھی سورج سے ہی نکلا ہے۔ اگر قدیمی دنیا اپنی حاجات کو آفتاب کی طرف لے گئی تو یہ ایک طبعی امر ہے۔ سورج اپنی سالانہ کیفیات مختلفہ میں تاثیریں زمین پر ڈالتا ہے اس کی تمازت اور اس کی روشنی ہی انسان کی زندگی اور راحت ہے، اس کا چھپ جانا۔ یا اس کا ہماری آنکھوں کے سامنے کم و بیش وقت کے لئے آنا۔ ہماری اُمید و بیم کا باعث ہوتا ہے موسم خزاں جو زمین پہ ایک موت لے آتی ہے اور موسم بہار جس کے آنے پر زمین دوبارہ زندہ ہوتی ہے۔ یہ بھی دراصل آفتاب کی ہی مختلف کیفیات ہیں۔ اب اگر ہم اُس زمانہ کو اپنے سامنے رکھیں جبکہ روایات اور قصہ کہانیوں میں مذہب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جب ہر ایک مظہر قدرت کے ساتھ ایک نہ ایک دیوی دیوتا وابستہ کر دیا جاتا تھا۔ اور اُن مظاہر قدرت کو انسانی خط و خال سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ اُن کی پیدائش اور ان کی زندگی کے بعض واقعات کے دن مقرر کر کے تہوار منائے جاتے تھے یہ واقعات اور پیدائش اور موت کے دن دراصل اُن مظاہر قدرت کی کیفیات سے ہی اخذ ہوتے تھے۔ ہندوستان کے لوگ اِن باتوں کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں دیوالی بیساکھی۔ بسنت۔ لوہڑی وغیرہ مختلف موسموں کی ہی کیفیتیں ہیں۔ آج تک

کسوف و خسوف کے متعلق پرانی روایتیں یونہی چلی آتی ہیں، کہ چندرماں اور سورج دیوتا کسی دیو کے قبضہ میں آ گئے ہیں۔ اُن میں اور اُس شیطان میں جنگ ہے۔ جس کے پنجے سے وہ آخر نجات پاتے ہیں۔ اسی طرح سورج کی مختلف کیفیات بھی مختلف داستانوں کا موجب ہو گئیں۔ وجوہ بالا سے یہ امر مستبعد نظر نہیں آتا کہ ایک وقت دنیا کے بہت سے حصہ کے لوگ کیوں سورج پرست نہ ہوں۔ چنانچہ جناب مسیحؑ کی پیدائش سے پہلے اور اُن کی پیدائش سے تین چار صدی تک جن ممالک کا اس کتاب میں سورج پرستی کے متعلق ذکر آیا ہے، وہ سب کے سب کُرّۂ زمین کے شمالی حصہ میں تھے اس لئے جن آفتابی کیفیات سے اِن ممالک میں مختلف مذہبی روایات پیدا ہوئیں وہ ایک ہی نوعیت اور ایک ہی وقت میں پیدا ہوتی ہیں۔ ان روایات میں دو تاریخیں متمیز ہیں۔ ایک وہ دن جس وقت شمالی کُرّۂ زمین میں سورج اپنی نمازت اور روشنی میں بڑھنے لگتا یا بالفاظ دیگر دن بڑا ہونے لگتا ہے یہ وہی ۲۵ دسمبر کا دن ہے جسکا آغاز ۲۴۔ دسمبر کے بعد کی نصف رات کے بعد شروع ہوتا ہے وہی وقت **متھرا** اور دیگر سورج دیوتاؤں کی پیدائش کا دن ہے یہی وہ وقت ہے، جب افق مشرق پر ایک طرف اُن ستاروں کا جھنڈ (خوشۂ پروین) نظر آتا ہے، جو برج **سنبلہ** یا برج کنیا سے وابستہ ہیں۔ یہی وہ وقت ہے جب سورج کی پیدائش کا دن منایا جاتا تھا۔ اور بعض شماسی قوموں

میں پرستار یوں اُٹھتے تھے کہ کنواری نے بچہ جنا۔ یہ باتیں مسیحؑ سے پہلے جو ہیں موجود تھیں میں اُوپر لکھ آیا ہوں کہ مصری نقشہ برج میں سنبلہ یا کنیا کے محّہ میں ایک کنواری بچے کو گود میں لئے ہوئے کھڑی دکھائی دیتی ہے۔ بعض مصری نقشہ جات میں یا کرہ **آئی سس** کو دکھلایا گیا جو **ہورس** کو لئے کھڑی ہے۔ میں یہ دکھلا چکا ہوں کہ مریم اور بچے والا بُت **آئی سس** اور **ہورس** کی ہی نقل ہے دوسری طرف جناب مسیحؑ کی پیدائش کا دن ۲۵۔ دسمبر کسی طرح ثابت نہیں ہوتا۔ اب اگر ایک شخص اس بات کے ماننے پر مجبور ہو جائے کہ ولادت مسیح کے واقعات کوئی تاریخی حیثیت اپنے اندر نہیں رکھتے۔ بلکہ وہی پرانی کہانی ہے تو کیا کریں خصوصاً جب ولادت گاہ مسیح کا طویلہ بقول شہید **جسٹن** وہی **اوجیس** کا اصطبل ہے۔ اس کے متعلق منجمانہ تحقیق یہ ہے کہ شمس پرستی کے قدیمی ایّام میں پیدائش سورج کے دن عین زمین کے نیچے برج جوزہ والے ستارے نظر آتے تھے۔ برج جوزہ کا نام **اصطبل اوجیس** ہی تھا۔ (کتاب آورسن گوڈ صفحہ ۱۴۸) برج جوزہ کی بیٹی کے ستارے بھی عدد میں تین ہی ہیں۔ ان تین ستاروں کا نام پرانی کتابوں میں تین بادشاہ رکھا گیا ہے (ایضاً صفحہ ۱۵۰) الغرض سورج اور مسیحؑ کی پیدائش کے وقت شمس پرستوں کے سر میں کنواری کا خیال برج سنبلہ نے دیا اور ولادت گاہ خیال برج جوزہ نے جس کے ہمراہ تین بادشاہ ۲۵۔ دسمبر

کی صبح کو نظر آتے ہیں۔ عیسائی اصحاب جو پسند فرماویں تشریح کر لیں ؛
سورج کی دوسری کیفیت متمیزہ وہ ہے جو موسم بہار میں پیدا ہوتی ہے۔ ۲۵۔ دسمبر سے چل کر ۲۳۔ مارچ تک سورج اپنی طاقت یعنی روشنی اور حرارت میں بڑھتا جاتا ہے۔ اس بات کو کیسے لطیف شاعرانہ پیرایہ میں سورج دیوتا **اپالو** کے متعلق ظاہر کیا گیا ہے **اپالو** جب ۲۵۔ دسمبر کو پیدا ہوا تو اُس کے سر پہ ایک ہی بال تھا یعنی ایک ہی شعاع ۲۳ مارچ کو سورج اپنے بیضوی دائرے میں گھومتا ہوا خط استوا پر آجاتا ہے۔ جس وقت دن رات برابر ہوتے ہیں۔ دو دن تک اُس کی یہی کیفیت رہتی ہے۔ ان کیفیات آفتابی کے متعلق جو ۲۵۔ دسمبر سے ۲۵۔ مارچ تک پیدا ہوتی ہے۔ پرانی شماسی روایات یہ تھیں۔ کہ ظلمت کا دیو جو آفتاب کا دشمن ہے اور جس کے پنجہ سے ۲۵۔ دسمبر کو سورج نکلا ہے اُس میں اور سورج مہاراج میں ایک مستقل جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ یہ جنگ روزانہ ہوتی ہے اور ہر روز سورج تھوڑا تھوڑا، دیو ظلمت پہ غالب ہی آجاتا ہے یعنی دن بڑھتا جاتا ہے۔ ۲۳۔ مارچ تک تو یہی کیفیت رہتی ہے لیکن اُس کے دو دن تک سورج کوئی ترقی نہیں کرتا اور ایک ہی جگہ پہ کھڑا رہتا ہوا نظر آتا ہے، گویا خدائے نور۔ اور خدائے ظلمت میں یہ ایک آخری جنگ ہے جس میں وہ خدائے نور یعنی آفتاب جو ہر روز تھوڑا بہت دیو

ظلمت پر غالب ہی آتا تھا - اب کچھ ایسا اُس کے پنجہ میں آ گیا کہ اُس کی رفتار رُک گئی - وہ بظاہر مر گیا - لیکن دو دن کے بعد سورج اُسی بڑھنے والی طاقت کے ساتھ نمودار ہو گیا اسی طرح دیو کے چنگل سے نکل کر آزاد ہو گیا - یہ وہ وقت ہے جب سورج بُرج حمل میں آ داخل ہوتا ہے جس کی شکل فلکیات میں **میگ** یعنی بچھڑے کی دکھلائی گئی ہے یہ وہ بچھڑا ہے جو ہر ۲۳ - مارچ کو صلیب مذکورہ بالا چڑھتا ہے، چونکہ اس بچھڑے کے مصلوب ہونے کے دو دن بعد ہی سورج آب و تاب سے نکلتا ہے یہی وہ وقت ہے جب سورج کی یہ نئی روز افزوں کیفیت بہار لاکر مردہ زمین کو از سر نو زندہ کرتی ہے -

اس لئے مسیحؑ سے پہلے ہی صلیب اور بچھڑا نئی زندگی کا نشان سمجھا گیا جو دو دن کے بعد آب و تاب سے نکلتا ہے - اگر کوئی اِن باتوں کو ایک تکلفانہ تشریح کہے تو کہہ بھی سکتا ہے لیکن اس بات کا کیا جواب ہے کہ مسیحؑ کی پیدائش سے بہت پہلے بچھڑہ اور اُس کی قربانی کا تعلق **منتھر ابیکس** اور **اپالو** کے ساتھ مسلم ہے - صلیب پرستی بھی قدیم سے ہے - صلیب قدیم سے ہی نشان زندگی تو مانی گئی ہے - اور یہ زندگی تو موسم بہار پر پیدا ہوتی ہے جس کی تاریخ پھر وہی اخیر مارچ ہے - کراس کیک اور انڈے اس موقعہ پر پہلے بھی کھائے جاتے تھے :-

سورج کی تیسری کیفیت ۲۳ - ۲۴ جون کو پیدا ہوتی ہے جس دن

ورج اپنے کمال کو پہنچ کر گھٹنا شروع ہوتا ہے، بعض قدیمی شماسیوں نے اسے سورج کی موت کا دن بھی تصور کیا ہے چنانچہ اسی تاریخ کو سورج دیوتا **ایڈونس** قتل ہوتا ہے اور موسم بہار میں دوبارہ زندہ ہوتا ہے، عیسائی روایات میں اس تاریخ کو یوحنا اصطباغی کی تاریخ ولادت ٹھہرایا گیا ہے۔ تاریخاً اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ لیکن انجیل یوحنا باب۳۔ آیت ۳ سے اس بات کی تشریح ہو جاتی ہے۔ جہاں یوحنا مسیح کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے کہ" وہ تو بڑھے گا اور میں گھٹوں گا اب اگر مسیحؑ کی پیدائش ۲۵ ر دسمبر کو ہے اور یوحنا کی ۲۵ر جون کو تو یہ امر بھی صاف ہو گیا کیونکہ ۲۵ر دسمبر کے بعد سورج بڑھتا ہے۔ اور ۲۴-۲۵ جون کے بعد گھٹتا ہے یعنی ۲۵ر دسمبر کو وہ پیدا ہوتا ہے جس نے بڑھنا ہے اور ۲۵ر جون کو وہ جس نے گھٹنا ہے۔ یہ کوئی تکلفانہ تشریح نہیں ہے جبکہ انجیل کی بہت سی آیات سورج کی مختلف کیفیات کی طرف ہی اشارہ کرتی ہیں چنانچہ ذیل میں میں چند آیات دیتا ہوں آج یہ امر مسلم ہو گیا ہے کہ انجیلیں بہت بعد ——— میں لکھی گئیں جب اس وقت کے معلمان مسیحیت اپنے مذہب کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے شماسی روایات اور **پیگن ازم** کی دوسری روایات کو لگاتار اپنے مذہب میں داخل کر رہے تھے۔ انجیلوں کے اور بہت سے فقرے بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں یوحنا باب۱۳ آیت ۱۳ میں جناب مسیح فرماتے ہیں اور

آسمان پر کوئی نہیں چڑھا سوا اُس کے جو آسمان سے اُترا ہے، ابن آدم بھی جو آسمان میں ہے"۔ یہ فقرہ مسیحؑ کے منہ سے نہیں نکل سکتا وہ یہودی تھے اُن سے پہلے دو بزرگ جو آسمان سے تو نہیں اُترے تھے لیکن آسمان پر چڑھ گئے تھے۔ ایک ایلیا دوسرا ادریس یا حنوک علاوہ ازیں اُس وقت تک مسیحؑ آسمان پر نہیں چڑھے تھے۔ پھر وہ تو زمین پر تھے وہ کیسے کہہ سکتے ہیں ابن آدم بھی جو آسمان میں ہے البتہ شمسی روایات کو سامنے رکھو تو لفظ لفظ اس آیت کا حل ہو جاتا ہے۔ سورج آسمان سے اُتر کر ۲۵۔ دسمبر کو پیدا ہوتا ہے۔ وہی آسمان پر چڑھتا ہے وہی آٹھوں پہر آسمان پر ہے۔ اس کے علاوہ ذیل کی آیات بھی قابل غور ہیں۔ یوحنا باب ۸ آیت ۱۲ اور دنیا کا نور میں ہوں جو میری پیروی کرے گا وہ اندھیرے میں نہ چلے گا بلکہ زندگی کا نور پائے گا"۔ دو ہزار برس سے تو آج تک مسیحی نور ہر جگہ نہیں پہنچ سکا۔ لیکن سورج پر یہ فقرہ لفظاً اور معناً پورا ہوتا ہے پھر یوحنا باب ۹ کی آیت ۴۔ ۵ حسب ذیل ہے "جس نے مجھے بھیجا ہے اُس کا کام مجھے جب تک دن رہے کر لیتا ہے رات جب آتی ہے تو کوئی کام نہیں کر سکتا جب تک میں دنیا میں ہوں دنیا کا نور ہوں" یہاں بھی یہ باتیں سورج پر ہی محقق ہوتی ہیں مسیح تو دن رات اپنی تبلیغ میں مصروف تھے۔ البتہ آفتاب کے کام کے وقت معین ہیں۔ اسی قسم کے

اور بھی فقرات انجیل میں ہیں۔ خصوصاً انجیل یوحنا میں جس کی تصنیف کے متعلق یہ امر متحقق ہے کہ وہ مسیح سے کئی صدیوں بعد ہوئی اور اسکندریہ کے مذہب فلسفہ کے تاثرات سے خالی نہیں۔ لیکن یہاں میں ایک ذیل کا بھی حوالہ دیتا ہوں یعنی یوحنا باب ۱ ۹-۱۰ حقیقی نور جو ہر ایک آدمی کو روشن کرتا ہے۔ دنیا میں آنے کو تھا، دنیا میں تھا، اور دنیا اُس کے وسیلے سے پیدا ہوئی" خوش اعتقادی کو چھوڑ کر ان الفاظ پر غور کرو۔ یہ لفظاً اور معناً سورج اور اُس کے عمل کو ظاہر نہیں کرتے تو اور کس چیز کو ظاہر کرتے ہیں۔ سورج ہی آٹھوں پہر دنیا میں ہے۔ سورج سے ہی زمین نکلی۔ اور زمین سے انسان۔ نہ صرف سورج آدمی کو روشن کرتا ہے بلکہ انسان کے اندر جو کچھ بھی ہے۔ اُس کا گوشت پوست۔ دل۔ دماغ۔ سب کا سب سورج ہی کے وسیلے سے ہے۔ یہ ایک علمی حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ اس حقیقت کی روشنی میں یوحنا کے ان الفاظ کو پڑھو تو پھر یہ الفاظ سورج ہی پر چسپاں ہوتے ہیں۔ ہاں! اگر اس نظریہ کو سامنے رکھا جائے جیسے ان اوراق نے مبرہن کردیا ہے، اور وہ یہ ہے۔ کہ قدیمی راہبوں نے جن میں سے ایک انجیل یوحنا کا مصنف بھی تھا۔ مسیحؑ کو شمس پرستوں کے سامنے قدیمی سورج دیوتاؤں کا ایک قائم مقام پیش کیا۔ اور اُس کے متعلق وہی باتیں لکھیں جو شمس پرستوں میں دائر و سائر تھیں۔ سورج کی چوتھی کیفیت ۲۳ ستمبر کو واقعہ ہوتی

ہے جس کے بعد سورج بالکل ہی کمزور ہو جاتا ہے۔ دن گھٹنے لگتا ہے اور ایک ماہ بعد یعنی ۲۳۔ اکتوبر کو سرما آجاتی ہے۔ پاکستان سے کسی قدر اور شمال میں اگر ان دنوں جا کر دیکھا جائے تو دن بھی چنداں روشن نظر نہیں آتا جتنی کہ ایران کے شمال میں نو گھنٹے تک دن آجاتا ہے۔ یہ کیفیت اُسی وقت شروع ہوتی ہے جب آفتاب برج عقرب میں آجاتا ہے سورج دیوتا کے دشمن کی تصویر جو سورج پرستوں نے کھینچی ہے وہ عقرب کی ہے جس کی دم خاردار ہے، مسیحی تحریروں میں شیطان یا دیوظلمت کو بے شک سانپ سے نسبت دی گئی ہے۔ لیکن جہاں شیطان کو انسان کی شکل میں دکھلاتے ہیں۔ وہاں اس کی دم خاردار ہی دکھلائی جاتی ہے، وہ لمبا کوٹ پہنے ہوئے تو نظر آتا ہے لیکن خاردار دم کو نہیں چھپا سکتا، یہ مانا کہ سانپ تو قصہ آدم سے لے لیا گیا ہو لیکن دنیا میں وہ کونسا سانپ ہے جس کی دم خاردار ہو۔ اب اگر مسیحؑ آفتاب صداقت ہے تو پھر اس آفتاب پر دیوظلمت اُسی وقت غالب آتا ہے جب وہ برج عقرب میں جاتا ہے، بہت سی اور باتیں مسیحی مذہب میں جو نہ صرف شمس پرستی سے بلکہ پیگن آزم کی دوسری شاخوں سے بھی لی گئی ہیں مسیحؑ کے بارہ حواری ہوں یا **اپالو** کے یا **ہرکولیس** کے بارہ کارنامے یہ وہی بارہ برج ہیں آخر **اپالو** یا **ہرکولیس** کوئی تاریخی ہستیاں نہیں۔

وہ تو شماسی تخیلات کی ایک تصویر ہے، اگر اُن کے بارہ دوست مسلّمۂ بارہ برج ہیں تو وہی تشریح حواریوں کی تعداد پر کیوں حاوی نہیں۔ پھر **یہوداسکریوطی** ہی نہیں اُس سے پہلے بھی بارہ میں سے ایک پہلے سورج دیوتاؤں کو گرفتار کراتا ہے وہ **بُرج عقرب** نہ سہی **برج قوس** سہی بارہ میں سے ایک برج میں جاکر سورج بالکل کمزور ہوجاتا ہے۔ اگرچہ متقدمین نے عقرب کو ہی لیا ہے۔ میں نے اوپر لکھا ہے کہ مسیح کا دوسری تیسری صدی تک نشان مچھلی تھی۔ جن لوگوں نے مسیح کی پیدائش ۲۵۔دسمبر ٹھہرائی ہے۔ وہ تاریخ قرار حمل کے لئے وہی مہینہ تجویز کریں گے، جب سورج بُرج حوت میں ہوگا، یہ باتیں اور بھی مضبوط ہوجاتی ہیں، جب ہم کیتھلک تہواروں کی دوسری تاریخوں کو دیکھتے ہیں، مثلاً کیتھک مذہب میں ایک تہوار ۱۵۔ اگست کو منایا جاتا ہے۔ جیسے اسینشن آف دی ورجن کہتے ہیں۔ یعنی خدا کے نور نے مریم کو لے لیا اور وہ زمین سے غائب ہوگئی، ہماری اصطلاح میں اُسے معراج مریم کہہ سمجھئے۔ اسی طرح تاریخ پیدائش مریم ۸۔ستمبر مانی گئی ہے۔ ان دونوں تاریخوں کو بھی سورج اور بُرج سنبلہ یعنی کنیا سے تعلق ہے۔ ۱۵۔اگست کو وہ تارے جو کنیا کے پاس ہوتے ہیں۔ سورج کے قریب آجانے اور بُرج سنبلہ میں داخل ہونے سے نظر نہیں آتے، یہ وہی تاریخ ہے جس وقت کنیا کے تارے چھپ جاتے ہیں۔ پھر ۸۔ستمبر کو پروین سنبلہ یعنی کنیا نظر آجاتی ہے۔ مریم کے

طھر کی تاریخ فروری کو منائی جاتی ہے۔ اُس میں مومی شمعیں ہاتھ میں لے کر پادری چلتے ہیں چنانچہ اسے **کینڈل ماس** کہتے ہیں۔ رومی بُت پرست اسی مہینہ میں ایک ہی وقت دو تہوار مناتے تھے ایک تو **دیوی جنو** کے طھر کا وہ دن تھا دوسرا **باکرہ سیریس**۔ پراسر **پائین** کی تلاش میں شمع جلائے نکلتی تھی، رومیوں کے ہاں ابتدائے نومبر میں مردگان کی یاد میں ایک تقریب منائی جاتی تھی۔ جب خیال کیا جاتا تھا کہ اُن کی روحیں آتی ہیں۔ آج ہم اُسی تاریخ پر کیتھلک فرقہ میں یوم ارواح کو پاتے ہیں۔ ۲۸۔ دسمبر کو جو کیتھلک کے ہاں قتل معصومین کا دن ہے اُسی تاریخ کو رومی لوگ ایسی ہی روایت کا ایک دن مناتے تھے۔

اب میں صرف ایک اور بات کا ذکر کرکے ان پُرانی کہانیوں کو ختم کرتا ہوں، یہ امر تو **شہید جسٹن** کے بیان سے ثابت ہو گیا کہ عشاء ربانی متھرا پرستی میں ہوا کرتی تھی، متھرا مذہب مسیحؑ سے پہلے کئی صدیوں ایران میں تھا ستر برس مسیح سے پہلے اُس کا دور دورہ سلطنت روما میں شروع ہوا، جہاں سے یہ مذہب کل یورپ میں پھیل گیا۔ آئرلینڈ کے علاوہ انگلستان کے بعض مقامات مثلاً **چسٹر** اور **یورپ** میں اس کے کھنڈرات آج پائے گئے ہیں، بہرحال عشاء ربانی کے متعلق جو عقیدہ عیسائیوں کا ہے، اس عقیدے سے پُرانی دنیا خالی نہ تھی، عشاء ربانی کی روٹی اور شراب گویا جناب مسیح کے جسم اور خون

کی یادگار ہے جیسے چکھ کر ایک پرستار کا جسم اور خون مسیح کا جسم اور خون ہو جاتا ہے اسی طرح مسیح کے خون سے انسان کے گناہوں دھل جانا بھی ایک پرانی بات ہے **ڈایونیس** کے خون سے بھی انسانوں کی پاکیزگی ہوتی تھی (پیگن اینڈ کرسچن کریڈ صفحہ ۱۶۵) قدیمی **اسیرس** کے دوبارہ زندہ ہونے پر عشاء ربانی کی رسم مناتے تھے۔ مقدس روٹی کھائی جاتی تھی۔ جس پر پہلے کاہن تقدیس دیتا تھا جس سے وہ اسیرس کا گوشت ہو جاتی تھی (کتاب دی گریٹ لا آف ریلیجس آدریجن مصنفہ ولیم سن صفحہ ۱۷۵) ڈاکٹر فریزر اپنی کتاب گولڈن باؤ میں ایک امریکن قوم کا حال لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ لوگ ماہ دسمبر میں اپنے بڑے دیوتا کا ایک بت خمیرے آٹے سے بناتے تھے پھر اُسے توڑ کر کھاتے تھے **کنگز بارو** نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۳۰ پر اہل میکسیکو کی عشاء ربانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ لوگ روٹی بناتے پھر اس کے ٹکڑے کرتے اور پھر اُن کا مذہبی پیشوا اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو ہر ایک پرستار کے مُنہ میں ڈالتا اور اسے سمجھا جاتا تھا کہ وہ اپنے خدا کا گوشت کھا رہے ہیں یہ تو خیر پرانی باتیں ہیں آج بھی چینی لوگ شراب کو کنفیوشس کے تیلیوں سے بنے ہوئے مجسمے پر ڈالتے ہیں پھر اُس شراب کو پیتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ کنفیوشس کی برکت اُن میں آ گئی اسی قسم کی باتیں چینی تاریخوں میں عام طور پر جنہیں

آج فادر گروبر دیکھ کر وہی کہتا ہے۔ جو صدیوں پہلے شہید جسٹن نے کہا میں بڑے زور سے کہتا ہوں کہ "شیطان" تاتاریوں میں کیتھلک کلیسا کی پوری نقل اتار رہا ہے۔ حالانکہ نہ وہاں کوئی عیسائی گیا ہے نہ کوئی یورپین، لیکن وہ لوگ بالکل کیتھلک کلیسا کی باتیں کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ عشاء ربانی بھی شراب اور روٹی سے بناتے ہیں یہ باتیں میں نے اپنی آنکھ سے دیکھی ہیں (انٹروڈکشن ٹو دی ہسٹری آف ریلیجز مصنفہ جیون ص ۱۴۸/۲۱۹)

یہ مسئلہ کہ ابن آدم نے آکر نسل انسانی کو اگر گناہ سے نجات دی۔ کوئی نیا مسئلہ نہیں جن بیگن دیوتاؤں کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں متھرا۔ ہورس ہرکولیس۔ ایڈونس ان سب کی مائیں کنواری ہی تھیں، سب کے سب یا مسیح کی سی موت سے مرے، یا خود انہوں نے اپنی جان دی۔ ان سب کے خون نے لوگوں کے گناہ دھوئے۔ یہ سب کے سب پھر جی اُٹھے، نیپال اور تبت میں اندر دیوتا اپنے خون سے ہی انسان کو نجات دیتا ہے، یہ خون وہی آسمانی بارش ہے جو بارش کے دیوتا اندر کے جسم سے نکل کر زمین کے رہنے والوں کو ہر مصیبت سے نجات دیتا ہے۔ دوسری طرف سورج دیوتا کے جسم سے سرخ شعاؤں کی شکل میں خون اُتر کر زمین کو نئی زندگی بخشتا ہے، اس زندگی کے بخشنے کے ایام ایسٹر کے دن سے شروع ہوتے ہیں جس سے دو دن پہلے سورج دیوتا بچھڑے کی شکل میں یعنی برج حمل

ہیں اُس صلیب پر چڑھتا ہے جو اُس کی سالانہ حرکت کا بیضوی دائرہ ہے خط استوا پر بناتا ہے۔ مسیح نے ہی پہلے انسان کے گناہ سر پہ نہیں اٹھائے۔ جناب بُدھ نے بھی ایک موقعہ پر فرمایا ہے کہ کل دنیا کے گناہ مجھ پر لاد دو تاکہ دنیا نجات پائے (تاریخ سنسکرت لٹریچر مصنفہ میکس میولر) **سکینڈی نیویا** کا خدا **اوڈن** جو خود ہی درخت کے ذریعہ پھانسی پر چڑھا وہ کہتا ہے "میں جانتا ہوں کہ میں خود ہی پھانسی پر چڑھا تھا، مجھ کو برچھی چبھوئی گئی، میں خود اوڈن یعنی اپنے آپ سے یہ کہا تھا۔ کہ میں ایسا کروں گا"۔ **کرشن جی** مہاراج کہتے ہیں "میں خود ہی قربانی ہوں، یہ جو لوگ چڑھاوے چڑھاتے ہیں وہ میں خود ہوں" **اندر سوم ہری** اور دوسرے دیوتا مختلف جانوروں کی شکل میں آکر نسل انسانی کے بچانے کے لئے قربان ہوتے ہیں"۔ **شو جی** مہاراج کہتے ہیں "اصل چڑھاوے کا جانور تو میں خود ہوں، جیسے تم میرے مذبح پر ذبح کرتے ہو وہ میں ہی ہوں"۔ بدھ ملاء اعلیٰ سے انسان کو عذاب سے بچانے کے لئے دنیا میں جنم لیتا ہے اور یہ الفاظ کہتا ہے کہ "میں اگر انسانی جسم اختیار کرنے لگا ہوں تو اس لئے نہیں کہ کوئی عیش و عشرت کروں۔ بلکہ اس لئے کہ انسانوں میں پیدا ہو کر جسم اور گوشت (انسان) کو تکالیف سے بچاؤں اور ان کے دکھ درد دور کروں"، چین کا معبود **طین** تمام دنیا میں اس لئے آیا کہ

راستبازی کو قائم کرے۔ نسل انسانی کے بچانے کے لئے اور دنیا کو موت سے نجات دینے کے لئے وہ مرتا ہے۔ کیونکہ اُس کے نزدیک خداوند کے حضور اس سے بہتر قربانی نہیں (ریلیجس ایڈیاس مصنفہ پیریگ جلد اوّل صفحہ ۲۱۱) ایڈونس کی موت کی یاد کی رسم میں بڑا کاہن یہ الفاظ کہتا ہے۔" اپنے خداوند پر ایمان لاؤ کیونکہ جو کچھ تکالیف اس نے سہیں وہ ہماری نجات کے لئے سہیں۔" الغرض کل کے کل ممالک جو زمانہ قدیم میں کائنات اور عناصر کی مختلف حیثیتوں کے پرستار تھے اور انہیں کائناتی کیفیات کو انہوں نے خدا اور دیوتے بنا رکھے تھے۔ ان میں سے اکثر سورج پرست تھے۔ اسی ایک عقیدہ کے پرستار نظر آتے ہیں کہ انسان کی مصیبت اور تکلیف سے نجات اسی میں ہے کہ خود خدا تکلیف اٹھائے۔ سورج کو ہی دیکھ لیا جائے۔ جس سے ہمارے کل کے کل جسمانی مفاد وابستہ ہیں۔ اس کی روشنی اور گرمی ہماری سب تکالیف کا علاج کرتی ہے اب اس کا گھٹنا بڑھنا اگر اس کی تکلیف وراحت سمجھ لیا جائے۔ اس کا گہن میں آجانا۔ اس کی سکرات موت قرار دی جائے۔ اور اسے خدا مان لیا جائے جو انسانی جامہ میں زمین پر آئے تو کیا وہ اپنی موت اور تکلیف کو برداشت کر کے نسل انسانی کو نجات نہیں دیتا۔ یہ سب کی سب باتیں ہر جگہ موجود تھیں۔ قدیمی لوگوں کا ایمان انہیں کہانیوں سے تر و تازگی پاتا تھا۔ مسیح کی پیدائش پر یہ سب باتیں موجود تھیں وہ قصے پرانے ہو چکے تھے۔

راہبوں نے ان سب کو مسیحؑ کی ذات کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ اس میں کیا شک ہے کہ جناب مسیحؑ خدا کے پیارے نبی تھے۔ عین ضرورت کے وقت حضرت مریم صدیقہ کے بطن سے پیدا ہو کر یہودیوں کی اصلاح کے لیے آئے ضرورت وقت کے لحاظ سے بہتر سے بہتر ہدایات دے گئے آج بھی اُن کی باتیں قابل عزت ہیں۔ اُن کے وقت کے یہودی علماء ریا کاری اور منافقت کا مجسمہ تھے۔ اُن کے نفاق کو آپ نے طشت از بام کیا جناب مسیحؑ کے ربانی علم کے مقابل اُن کے علم کا بازار ٹھنڈا پڑ گیا۔ ان باتوں سے علمائے وقت آپ کے دشمن ہو گئے۔ انہوں نے آپ کی تکذیب و تکفیر کی طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں لیکن جب وہ خدا کا نبی اپنے فرض منصبی سے نہ رکا۔ تو اُن پر سڈیشن کا الزام لگا کر عدالت میں کھینچا گیا۔ اُن پر موت کا فتویٰ حاصل کر کے اُن کو صلیب تک پہنچایا گیا۔ اللہ تعالےٰ کی حکمت بالغہ نے آپ کو اس لعنتی موت سے بچا کر آخر کار رفعت روحانی عطا فرمائی۔ یہ سب صحیح ہے اس پر ہم ایمان رکھتے ہیں لیکن آپ کے نادان دوستوں نے غلو محبت میں آکر آپ کے اصلی واقعات کو تو اہمیت نہ دی۔ بلکہ آپ کے سوانح میں بت پرستی اور کفر والحاد کی پرانی روایات کو داخل کر گئے انہیں سورج پرست دنیا کے سامنے ایک سورج دیوتا کی شان میں پیش کر دیا اُن دیوتاؤں کے قصے بھی انسانی لباس میں ہی تھے۔ ان کے بعض واقعات

بھی انسانی تھے۔ اس لئے مسیحؑ کی زندگی کے ملتے جلتے واقعات کو بھی قائم رکھا۔ لیکن اُن واقعات حقہ پر کچھ اس قدر شماسی رنگ چڑھایا، اور اس بات کی کوشش کی، کہ جو کچھ بھی روایات پارینہ میں تھا، وہ آپ کے سوانح میں آپ کے متعلق یہاں تک بھر دیا، کہ آج آپ کے وجود سے بھی بعض محققین مغرب کو انکار کرنا پڑا۔ امر حقہ یہ ہے کہ اُس وقت کی وہاں کی دنیا ایک ربانی معلم کی حیثیت میں کسی شخص کو وہ عزت دینے کیلئے تیار نہ تھی، جو اُن کے دلوں میں ان داستانوں کے ہیرو کی ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ مسیحؑ کو بھی اسی قسم کی داستانوں کا ایک ہیرو بنا دیا گیا۔ ابتدائی مسیحی صدیوں میں محبوب سے محبوب ہیرو تین چار تھے۔ ایڈونس۔ بیکس۔ اسیرس۔ متھرا۔ ان میں سے کسی کو لے لو، ان سب کی کہانیوں میں وہی باتیں موجود ہیں۔ جو قدیمی راہبوں نے جناب مسیحؑ کے بعض اصلی واقعات پر ایزاد کر دیں حتیٰ کہ وہ سب کے سب الفاظ و القاب جن سے جناب مسیحؑ کو آج تک مسیحی دنیا یاد کرتی رہی۔ ان میں سے ہر ایک کے پرستاران دیوتاؤں کے متعلق استعمال کرتے تھے میں نے اس کتاب میں اُنکے کچھ کچھ حالات دیدیئے ہیں۔ میں پھر بیکس دیوتا کی یہاں چند باتیں لکھدیتا ہوں۔ پڑھنے والے خود پڑھ کر دیکھ لیں کہ وہ مسیحؑ کی ہیں یا بیکس کی۔

وھو اھذا

"زمین کل گناہ اور ناراستی سے بھری ہوئی تھی اور ہلاکت کے منہ میں آئی تھی، جو پیٹر (خدا) نے ارادہ کیا کہ وہ دنیا اور انسان

کو مصیبت سے بچائے اور اپنا اکلوتا بیٹا بھیج کر دنیا کو ہلاکت
سے نجات دے۔ وہی کل دنیا کا معبود ہوا اور دنیا نے اُس کی تقدیس
کے گیت گائے۔ چنانچہ جو پیٹر (خدا) نے ایک عفیفہ کنواری پر سایہ
ڈالا وہ حاملہ ہو گئی، اور اُس نے دُنیا کے نجات دہندہ کو جنا۔ وہ
دنیا میں آیا۔ اُس نے انسانوں کے دکھ درد دور کرنے کے لئے اپنے
آپ کو دکھ اور درد میں ڈالا، اور مارا گیا اُس کے جسم کے ٹکڑے
ٹکڑے کئے گئے اُس کے پرستار اُس کو ان ناموں سے یاد کرتے
تھے۔ اکلوتا بیٹا۔ المقتول، گناہ اُٹھانے والا منجی"

(اوریجن آف ریلیجس بیلیفس مصنفہ ڈیوپیس ص۱۳۵)

آج مسیح کے متعلق یہ قول ہم بائیبل میں پڑھتے ہیں کہ میں دنیا کا الفا
اور اُمیگا (دنیا کی ابتدا و انتہا ہوں اور خداوند بیکیس نسل انسانی کو کہتا
ہے (بائیبل مبتصں مصنفہ ڈون صفحہ ۱۹۳) یعنی

"میں ہی ہوں جو تمہارا ہادی ہوں، میں ہی ہوں جو تمہارا حافظ ہوں
میں ہی ہوں جو تمہارا منجی ہوں، میں ہی الفا اور اُمیگا ہوں"

مسیحی منادالوہیت مسیح کے ثبوت میں اکثر مسیح کے چند فقرات کی
طرف اشارہ کر کے اسیات پر زور دیتے ہیں۔ کہ اُس کے الفاظ میں ایک
الٰہی اقتدار ہے اسی کے ضمن میں وہ الفا اور اُمیگا والے قول کو

کو بھی پیش کیا کرتے ہیں لیکن کیا **بیکس** کے الفاظ متذکرہ میں کچھ کم اقتدار پایا جاتا ہے۔

عشائے ربانی اس رسم کی حقیقت تو یہ ہے کہ روٹی اور شراب جو مسیح کی یاد میں اتوار کے دن گرجے کی عبادت کے بعد کھائی پی جاتی ہے، وہ مقدس ہو جاتی ہے، اور کھانے والے میں ایک قسم کی قدوسیت پیدا کر دیتی ہے کسی جگہ مشرقی ممالک میں جا کر دیکھ لو جہاں کوئی چیز قربان ہوئی ہے وہ مقدس ہو جاتی ہے۔ چڑھاوے کا گوشت ہر جگہ بابرکت سمجھا جاتا ہے اس کے کھانے سے عامہ عقیدہ کے ماتحت کھانے والے میں برکت اور پاکیزگی پیدا ہو جاتی ہے انہی باتوں کی دوسری شکل عیسائی **عشاء ربّانی** ہے، آخر حقیقت تو ایک ہے ایک ہستی قربان ہوتی ہے، وہ جانور ہو یا انسان۔ جانور کا تو گوشت اور بعض قوموں میں خون کھانے والے ہیں اس لئے پاکیزگی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ وہ جانور خدائی مذبح پر چڑھ کر الوہیت کا رنگ اپنے اندر پیدا کرے لیکن انسان کے متعلق آج وہ وقت نہیں کہ انسان کا بھی گوشت کھا لیا جائے اگرچہ تاریخ عالم میں ایسا زمانہ گزرا ہے کہ مقتول اور مصلوب منجیوں کی یاد میں انسان ذبح ہوتے اور اُن کا خون و گوشت کھایا جاتا۔ آج خون اور گوشت کی جگہ روٹی اور شراب رکھ دی جاتی ہے اور وہ بھی عیسائیت سے مختص نہیں بات ایک ہی ہے۔ جو قربان ہوا۔ اُسے انسان نے خدا بنایا۔ آج خدا نہیں لیکن تیوع ضرور ہو جاتا ہے

ستّی[1] ہونے والی بیبیاں جب چتا پر چڑھنے جاتی تھیں۔ تو خدا کا اوتار ہی سمجھی جاتی تھیں۔ اُن سے مرادیں مانگنا، اُن کے جسم کو ہاتھ لگانا، جو وہ کسی کے حق میں کہہ دیں اُسے خدا ہی کی بات سمجھنا یہ تو سب قربانی کے کرشمے ہیں۔ جسے ایک قوم نے الہیات میں داخل کر لیا ؛

---

[1] ہندوؤں میں رسم تھی کہ خاوند کے مرنے پر اُس کی بیوی بھی اُس کی چتا پر ہی جل کر مر جاتی تھی ؛

مسیحی فلسفہ

اور

کلیسی مصطلحات

کلیسیا کے سرائر اور باطنیات پر میں نے باب گذشتہ میں کماحقہ بحث کر دی ہے۔ اس ساری تحریر میں مَیں نے زیادہ تر مُورّخانہ حیثیت سے کام لیا ہے۔ ضروری اور طبعی تنقید کے علاوہ اپنی رائے دینے سے بھی احتراز کیا ہے میں عیسائی دوستوں پر ہی چھوڑتا ہوں کہ ان باتوں کے ہوتے ہوئے ہم میں سے کوئی اُن سے کس طرح متفق ہو جائے۔ وہ کونسی بات ہے۔ جو پہلے سے ہی بت پرستوں میں موجود نہیں۔ یہ تو ہی سورج اور بہار کی کیفیات کے نقشے ہیں۔ جو قدیم سے چلے آتے ہیں۔ انسان کی مشرکانہ طبیعت نے الٰہیات چھوڑ ہر ایک مظہر قدرت کو بُت پرستی کے رنگ میں رنگ دیا ہے اُسی کا ورثہ کلیسیا میں بھی آیا ہے۔ مسئلہ تثلیث بھی ایک پُرانی کہانی ہے۔ ہندوستان پہلے

سے ہی برما۔ وشن۔ مہیش کا پرستار تھا۔ یہ بھی نظارہ کائنات کے ہی مختلف نقشے ہیں۔ زمین پر ہمیشہ پیدائش۔ پرورش اور ہلاکت کا دور مستقل جاری ہے اسی حقیقت کو شاکتک مت نے غلیظ الفاظ میں **پاربتی۔ برما۔ وشن مہیش** کو جمع کر دیا ہے۔ وہی قوت خلق اور وہی قوت نمو (پرورش) اور وہی قوت ہالکہ اور وہی زمین جس پر ان تینوں قوتوں نے عمل کرنا ہے۔ اگر ہندوستان میں برہما۔ **وشن۔ مہیش** اور پاربتی ہے تو دوسری جگہ **باپ روح القدس۔ بیٹا** اور مریم ہے

یہی تین میں ایک اور ایک میں تین ہیں۔ وہاں پرانے تخیل نے ان حقائق کو مشرکانہ رنگ میں دیکھا ہر ایک چیز کو خدا بنا کر انہیں انسانی جامہ میں اُتارا۔ یہاں عیسائیت نے بھی مسیح کا حقیقی مذہب چھوڑا اس امر میں تصویر پرستی کی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ انسان کی عقل ابھی اسی قابل تھی کہ بت پرستی میں ہی اطمینان دیکھے بہرحال آج عیسائیت کے سوا جب کل دنیا نے ان ہستیوں کو تخیل کی ہستیاں قرار دے دیا۔ تو پھر کیوں کلیسی داستان کی یہی تعبیر نہ کی جائے مسئلہ تثلیث کے متعلق میں قدیمی یونانیوں کی ایک حکیمانہ حقیقت پر روشنی ڈالتا ہوں۔ اُس زمانہ کے لوگ ہر ایک چیز میں ایک روح کو قائم کر کے اُسے اپنا معبود ٹھہراتے تھے۔ اور یونانی اسے رب النوع کہتے تھے۔ چنانچہ برس کا بھی ایک رب النوع تھا۔ جس کی تین کیفیتیں

بتائی جاتی تھیں۔ پہلی کیفیت میں وہ زندہ ہوتا ہے۔ دوسری میں وہ مرتا ہے تیسری میں پھر جی اُٹھتا ہے اور جی اُٹھنے کے ساتھ ہی کل دنیا کو نئی زندگی بخشتا ہے۔ اس تیسری کیفیت کو یونانی ایک الگ مستقل وجود میں دیکھتے تھے۔ اس کا نام وہ **الثالث یا نجات دہندہ** رکھتے تھے۔ اب غور کرلو۔ کیا عیسائیت کی کہانی مختصر شکل میں وہی یونانی نہیں؟ وہی روح (خدا) کا پیدا ہونا۔ وہی مرنا۔ وہی پھر جی اُٹھنا۔ وہی اپنے جی اُٹھنے کے ساتھ دنیا کو زندگی بخشنا وہی تین میں ایک اور ایک میں تین "

(فورسٹیپز۔ صفحہ ۴۰ مصنفہ گلبرٹ مرے)

عیسائی فلسفہ کی بنیاد جس سے مسئلہ تثلیث اخذ کیا گیا۔ کچھ تو انجیل یوحنا کی ابتدائی آیات نے اور کچھ پولوس کی تحریرات نے ڈالی تھی۔ انجیل یوحنا کی ابتدائی آیات میں ایک خاص اور بظاہر ایک نئی حقیقت کا انکشاف کیا گیا ہے، وہ آیات حسب ذیل ہیں:-

"ابتداء میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا۔ اور کلام خدا تھا یہی ابتداء میں خدا کے ساتھ تھا۔ ساری چیزیں اس کے وسیلے سے پیدا ہوئیں۔ اور جو کچھ پیدا ہوا ہے۔ اس میں سے کوئی چیز بھی اس کے بغیر پیدا نہیں ہوئی"

اِن آیات کا مطلب یہ ہے کہ مسیح کی ذات دراصل خدا ہی ہے۔

جس کی پہلی شکل وہ کلام ہے، جس کا ان آیات میں حوالہ دیا گیا۔ یعنی مسیح بشکل کلام خدا میں سے نکلا۔ پھر اُسی سے سب دنیا بنی۔ اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ کلام کے ذریعہ بنا۔ اور اب تک قائم ہے۔ اس حقیقت کو ایک خاص انکشاف ربانی تسلیم کیا گیا ہے۔ جس کا الہام یوحنّا رسول کو ہوا حسبِ تعلیم کلیسا یوحنّا کی اس تحریر سے پہلے دُنیا کے علم میں یہ صداقت موجود نہ تھی۔ یہ بات یہاں تک تو صحیح ہے کہ اس امر کا پتہ عہد نامہ قدیم کے کسی صحیفہ سے نہیں چلتا۔ ان آیات کے مختلف ٹکڑوں نے پولوس کے لٹریچر میں نئی سے نئی اصطلاحیں اور نئی سے نئی توجیہیں پیدا کر دی ہیں۔ پولوس کے بعد کل کلیسی لٹریچر اسی ایک رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا ہے۔ یہاں نہ تو میں اُن تحریروں کا خلاصہ دیتا ہوں۔ اور نہ پولوس کی باتوں کا اقتباس کرتا ہوں۔ میں صرف اُن مصطلحات کا ذکر کر دیتا ہوں۔ جن سے مسیح اُن سب تحریروں میں اور آج بھی عیسائی سرمنوں (وعظوں) میں موسوم کیا جاتا ہے۔ اُن سب کی بنیاد دراصل یہی آیات سمجھی جاتی ہیں اور جس طرح یہ مصطلحات بنائی گئی ہیں۔ اُن کی یہاں مختصر سی توضیح بھی کر دیتا ہوں۔ ان آیات میں کلام سے مراد مسیحؑ ہے :-

"ابتداء میں کلام تھا۔ کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا۔"

اس لئے کلام یعنی مسیح خدا کا پلوٹھا بیٹا ہے۔ چونکہ کلام خدا سے نکلا ہے اور وہ خدا ہے۔ اس لئے کلام (مسیحؑ) دوسرا خدا ہے۔ اور تحت الوہیت

پر خدا کے ساتھ بلا فرق بیٹھا ہے۔ اس لئے خدا میں اور اس میں کوئی فرق نہیں۔ وہ خود خدا کی تصویر ہے چونکہ ان آیات کے مطابق کلام سے ہی ساری چیزیں بنی ہیں۔ اور اُسی سے سب چیزوں نے زندگی پائی ہے اس لئے کلام (مسیح) ہی خدا کی منشاء کو دنیا پر ظاہر کرتا ہے یعنی وہ خدا کا **ترجمان** ہے۔ اور چونکہ دُنیا کا بہترین خلاصہ انسان ہے۔ اس لئے **کلام** (مسیح) انسان کی شکل میں آیا۔ پھر چونکہ اُسی سے دنیا نے روشنی پائی۔ اس لئے وہی **کلام** (مسیح) خالق اور مخلوق میں ایک **واسطہ** ہو گیا۔ اور واسطہ ہونے کی حیثیت میں وہ خالق خدا کے آگے مخلوق کا **سفارشی** یا **نجات دلانے والا** ٹھہرا۔ اس لئے اس کا نام **بڑا کاہن** بھی رکھا گیا۔ یہی کلام (مسیح) وہ سرچشمۂ حکمت و زندگی ہے جس سے انسان **حیاتِ ابدی** کا پانی پیتا ہے اسی لئے وہی **شفا دہندہ** اور بیماریوں کا **علاج کرنیوالا** ہے۔ کلام (مسیح) چونکہ خدا سے ہے اور اُس کی پیدائش آسمانی ہے اس لئے وہ ہر ایک گناہ اور عیب سے پاک ہے۔ چونکہ اُسی سے روح انسان کو طاقت ملتی ہے۔ اس لئے وہی **ربانی روٹی** ہے۔ وہی انسان کا خبرگیر ہے۔ اس لئے وہی **مقدس گڈریہ** ہے جو خدا کے **گلے** کا **نگہبان** ہے۔ انسان اگر نجات پاسکتا ہے تو اسی صورت میں کہ اپنے قول و فعل کو کلام (مسیح) کے **مطابق** کرے۔ کیونکہ وہی خدا کا

قائم مقام ہے۔ انسان چونکہ گنہگار ہے۔ اور اس کی نجات اسی معاوضہ
کلام (مسیح) کے ذریعہ سے ہے۔ اس لئے مسیح ہی انسان کے گناہوں کا عوضہ
دیتا ہے اور گناہ کی قیمت ہے۔ خدا بھی اسی کلام کے ذریعہ انسان کو
پستی سے نکال کر بلند کرتا ہے۔ اور انسان کو اپنے پاس لے آتا ہے لہذا
انسان کے اعمال کچھ چیز نہیں۔ اس لئے اس کی نجات اسی میں ہے کہ وہ
اُس کلام (مسیح) پر ایمان لائے۔

اِن سطور بالا میں مَیں نے بیسیوں عیسوی کتابوں اور بیسیوں کلیسی
سرمنوں کا خلاصہ دے دیا ہے۔ میرے مطالعہ میں آئی ہوئی اِن کتابوں
یا سرمنوں کے علاوہ پولوس سے لے کر آج تک جو کچھ مسیحی فلسفہ اور لٹریچر
میں لکھا گیا۔ یا جو مسیحی منبر (پلپٹ فارم) سے آواز آئی ان سب کا نچوڑ
بھی یہی ہے۔ مَیں پھر دوبارہ اِن مصطلحات کو جن سے کلام یا مسیح موسوم
کیا گیا۔ استحضاراً ذیل میں لکھتا ہوں تاکہ ان پر جو مَیں تنقید کروں
وہ صریح الفہم ہو جاوے۔

خدا کا کلام۔ دوسرا خدا۔ خدا کا پلوٹھا بیٹا
خدا کے ساتھ بیٹھا ہوا۔ خدا کے ساتھ بلا فرق
تخت پر بیٹھا ہوا۔ خدا کی تصویر۔ خدا کا

ترجمان۔ مخلوق اور خالق میں منجی۔ شفیع یا نجات دہندہ۔ خدا اور انسان میں واسطہ۔ روحانی طبیب یا شفا دہندہ۔ ابدی حیات کا پانی پلانے والا۔ زندگی کی روٹی۔ مقدس اسوہ۔ خدا کا نائب۔ مقدس گڈریہ۔ خدا تک پہنچانیوالا۔ گناہ کی قیمت۔ سب چیزوں پر حکمران۔ خود خدا۔ گناہوں سے معصوم۔ بڑا کاہن۔ دُنیا کی روشنی خُدا کا پیارا بیٹا۔

یہی چند باتیں عیسائی فلسفہ کی مایۂ ناز ہیں۔ اس فلسفہ کی بنیاد الہام مانا گیا ہے اور کہا جاتا ہے۔ کہ یہ الہام دنیا میں سب سے اوّل انجیل یوحنا کے لکھنے والے یا پولوسی لٹریچر کے مصنف کو ہوا۔ کیونکہ آج یہ بات بھی ایک حد تک تسلیم کی گئی ہے۔ کہ یہ تحریریں جو پولوس یا یوحنا کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ وہ دراصل ان کی نہیں۔ بہرحال مجھے یہاں

اس سے بحث نہیں۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ان باتوں کا سرچشمہ یا ماخذ خدا کا الہام ہے یا انسانی دماغ اور وہ انسانی دماغ مسیحؑ سے پہلے کا ہے یا بعد کا۔

آج تحقیق اور تدقیق کا زمانہ ہے۔ مغربی تحقیق نے بال کی کھال اُتاری ہے۔ خدا مسلمانوں کا بھلا کرے کہ جنہوں نے فتح قسطنطنیہ کے بعد یونانی علمی خزانے اور اسکندریہ کے علمی جواہر ریزے عربی زبان میں ترجمہ کر کے دنیا میں محفوظ کر دیئے۔ اُن کی تحریروں نے متاخرین کو اصلی کتابوں کی طرف متوجہ کیا۔ اصلی کتابیں بھی مسلم امین ہاتھوں نے اپنے کتب خانوں میں محفوظ کر رکھی تھیں۔ وہ انقلاب زمانہ نے ہمارے گھروں سے نکال کر فرنگستانی کتب خانوں میں پہنچا دیں۔ اُن کے مطالعہ نے اس عیسائی فلسفہ کی حیثیت کو طشت ازبام کر دیا۔ اس سارے فلسفۂ کلام کا ماخذ لفظاً لفظاً حتیٰ کہ اُن پولوسی یا کلیسی اصطلاحات تک کا سرچشمہ وہ فلسفہ مانا گیا۔ جو مسیحی ابتدائی صدیوں میں بمقام اسکندریہ دائر و سائر تھا۔ جس کا بانی افلاطون تھا۔ اسی فلسفہ کی ایک بڑی معلمہ مصری خاتون ہائی پیشیا تھی۔ جو ایک عیسائی بشپ کے اشارے سے ۴۱۵ء میں ایک پادری نے قتل کر دی اسی فلسفہ کی کتابیں اسکندریہ کے کتبخانہ میں تھیں جسے اُس بشپ نے جس کا یہ بشپ جانشین تھا۔ سنہ ۳۹۰ء میں شہنشاہ تھی اوڈوسیس

سے اجازت لے کر جلوا دیا۔ کتابیں تو اب بھی بہت سی ہیں لیکن یہاں میں صرف ایک مصنف کو لیتا ہوں جن کا نام حکیم **فائیلو** ہے یہ اسرائیلی فلسفی بہت سی کتابوں کا مصنّف ہے۔ یہ اپنے وقت کا ایک مقتدر انسان تھا۔ بلکہ ایک دفعہ یہودیانِ اسکندریہ کی طرف سے سفیر ہو کر **کیلی گیولا** قیصر روم کے دربار میں بھی گیا تھا مسیح کی پیدائش سے ایک ہی نسل پہلے پیدا ہوا تھا۔ میں اُس کی تصانیف سے چند کتابوں سے ذیل کے اقتباس لیتا ہوں۔

"خدائے ابدی کا ابدی کلام ہی تمام چیزوں کی بنیاد ہے (DE PLANLATION No 1.331) کلام ہی خدا کی تصویر ہے۔ کل ذی عقل مخلوق سے وہی پہلے پیدا ہوا۔ وہ خدائے واحد کے ساتھ بغیر کسی فرق کے بیٹھا ہوا ہے (DE PEOFAGISI: 561/6) وہی اُس کا پہلوٹھا بیٹا ہے (DE Agric 1:308) خالق کائنات نے اپنے کلام کو جو آسمان میں سب سے قدیم و اعلیٰ ہے یہ عزت دی کہ وہ خالق و مخلوق میں سفارشی یا شفیع ٹھہرا۔ (QUIS REUIM DIOIN HARES I:501) لہٰذا کلام ہی تمام فانی چیزوں کے لئے (خدا کے آگے) **وکیل** ہے۔ (IBID 502) وہی کلام انسان کا جو ہمیشہ گناہ کرتا ہے شفیع ہے۔ کلام ہی خدا کا انسان کی طرف جو اُس کا ماتحت ہے رسول ہے وہی (کلام) سب چیزوں پر حکمران ہے (IBID 501) کو ذی فہم انسان ہے

جو عامۃ الناس کے اعمال دیکھ کر خدائے **نجات دہندہ** کو مخاطب کر کے یہ نہ پکار اُٹھے کہ وہی (خدا) گناہ کے بوجھ اُٹھائے اور روح

(خاطی) کی قیمت یا تاوان دے کر اُس روح (خاطی) کو از سرِ نو اصلی (پہلے نوشت) حیثیت تک پہنچائے DE CONFUS LING 1:418 - اس لئے خداوند ہر ایک انسان کو تاکید کرتا ہے کہ وہ زندگی کی دوڑ میں ربّانی کلام کے مطابق بلاکم و کاست اپنا راستہ تجویز کرے - کلام ہی تمام حکمت کا سرچشمہ ہے اسی مقدس چشمہ سے پانی پی کر انسان موت کی جگہ حیات ابدی پاتا ہے (DE PROFUGIS 1: 560, 31) ہم تسلیم کرتے ہیں کہ کلام ہی بڑا کاہن ہے - وہ بالا رادہ و بلاارادہ ہر قسم کے گناہوں سے پاک ہے کیونکہ وہ آسمانی پیدائش سے ہے (IBID, 1: 562, 13) خدا کا کلام طبیب اور تمام آزاروں سے نجات دہندہ ہے — (DE LEG ALLEG, 1·122, 17) اگرچہ ہر ایک شخص خدا کا فرزند کہلانے کے قابل نہیں تاہم اُسے اپنے حالات کی ایسی اصلاح کرنی چاہئے کہ خداوند کے پہلو بہ پہلو بیٹے (کلام کے حالات) کے مطابق اُس کے حالات ہو جائیں - کلام فرشتوں سے بھی پہلے پیدا ہوا - اُس کے (کلام کے) بہت نام ہیں مثلاً حکم - خدا کا نام - کلام - انسان کی تصویر (DE CONFU LING 1:427) خدا اُسی کلام کے ذریعہ جس سے اُس نے ہر ایک چیز کو بنایا - نیک انسانوں کو پستی سے اُٹھا کر اپنے قرب میں لے آئے گا - (DE SACRIFICIS 1: 165, 5) خدا کے تمام

کام کامل اور غلطی سے منزہ ہیں۔ خداوند نے اپنے پہلوٹھے یعنی کلام کو
اسی طرح اپنے مقدس گلے کی حفاظت کے لئے مقرر کیا ہے۔ جس طرح
کوئی طاقتور بادشاہ اپنا نائب مقرر کرتا ہے۔ (DE AGRIC 1-308)
مقدس کلام جو بڑا کاہن اور خدا کا پہلوٹھا ہے (DE SOMNIS
1-653) وہی اُس کے مقدس گلے کا گڈریا ہے (DE AGRIC 1:308)
وہ (کلام) انسان کی شکل میں (DE CONFU LING 1:427) خدا کا
ترجمان ہے۔ (DE LEGIS ALLEGOR III.73) جس طرح انسان
سورج کو تو نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن اُس انعکاس کو ہی سورج سمجھتا ہے اسی
طرح خدا کا کلام بھی جو اُسی کی تصویر ہے۔ خدا سمجھا گیا
(DE SOMN I:40,44) ربّانی کلام جو سب سے پہلے پیدا ہوا۔ وہی آسمانی
غذا ہے۔ وہی روٹی ہے۔ یعنی روح انسانی کے لئے خدا کی مقرر کردہ
غذا ہے۔ (DE LEG -ALLEG I:120,34 DE DELER
POTIORI INFID I,213-45) خدا کے اِدھر اُدھر دو اعلیٰ ہستیاں
ہیں۔ جن کے صفات نیکی اور قدرت ہیں اور اُن کے درمیان الوہیت ہے اور
وہ (خدا) اُن کے ساتھ متحد ہے (DE SACRIFICIS I:173,12)
کلام مقدس۔ بڑا کاہن بالارادہ یا بلا ارادہ گناہوں سے پاک
ہے۔ اسی لئے اس کا سر ممسوح ہوا (DE SOMNIS I:653)

یقینی اور قابل اعتبار با ثبات نعمت ایمان ہی ہے (DE ABRAHAM 0)
(38 : 11 ہر ایک انسان کے لئے جو باپ کے احکام بجا لاتا ہے ضروری
ہے کہ وہ اُس کے بیٹے کے پاس جو وکیل ہے۔ جائے۔ تاکہ اُس انسان)
کے گناہ بخشے جائیں۔ اور ہر قسم کی نیکی حاصل کر سکے ۔
(DE EXEERATIONIBUS II.435,29) اسی قسم کے انسان نجات
دہندے اور رحیم خدا سے نجات حاصل کریں گے۔ اور کلام کے
مطابق اپنے حالات کر کے نہایت برگزیدہ اور اعلےٰ فائدہ حاصل کریں گے
(DE SOMNIIS 106:414) کلام ہی دنیا کی روشنی ہے (IBID, II : 435)
خدا کا قائمقام (DE LEG ALLEG I:129,4) اور اُس کا پیارا بیٹا
"(DE SOMNIS I: 656,48) ہے

عیسائی دوستو! میں آپ سے راستی۔ صداقت۔ امانت۔ دیانت
بے تعصبی اور سب کے بعد خدائے قدوس کے نام پر اپیل کرتا ہوں کہ
وہ کونسا عقیدہ۔ یا کونسا فلسفہ یا کونسی الٰہیات یا کونسی اصطلاح
یا اُس کے ہمنواؤں نے یا بحیثیت مجموعی عیسوی کلیسیا نے تعلیم کی ہے
جس کا چرچا قدیم سے آج تک مسیحی گرجوں۔ مسیحی عبادتوں سرمنوں ۔
(وعظوں) میں مسیحی منادوں کی زبان پر۔ اور مسیحی پلیٹ فارموں (ممبروں)
سے ہو رہا ہے اور وہ مندرجہ بالا اقتباسات میں موجود نہیں۔ یہاں تو کسی

تکلیف اور ہیر پھیر کی ضرورت نہیں۔ صاف صاف الفاظ میں کلام کے متعلق حکیم موصوف (فائیلو) نے وہی عقائد اور وہی باتیں بیان کی ہیں۔ جو مسیحی کلیسیا کی روح رواں ہیں۔ میں مسیحی مصطلحات کو چھوڑ کر ذیل میں برعایت اختصار مسیحی عقیدہ کو لکھ دیتا ہوں۔ آدم صحیح فطرت لے کر پیدا ہوا۔ آدم کی غلطی سے انسانی فطرت میں خرابی واقع ہوئی۔ وہ اس خرابی سے اپنے اعمال کے ذریعہ نکل نہیں سکتا۔ اُس کے (آدم کے) اعمال خدا کے فضل کے سوا ہیچ ہیں۔ اُس کی نجات اُسی کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔ جو آسمانی پیدائش لے کر زمین پر آیا۔ وہ وہی خدا کا **کلام** ہے۔ جو اُس کا پہلوٹھا کہلایا۔ وہی ابدی ہے۔ وہی گناہوں سے پاک اور اس لئے وہی خدا کے ہاں انسانوں کا سفارشی اور شفیع ہے۔ وہی اس کا نجات دہندہ ہے۔ اُسی کے ذریعہ انسان گناہ سے مخلصی پا کر حیات ابدی حاصل کرتا ہے اور اپنی اصلی فطرت کو پالیتا ہے یعنی پُرانا آدم مر کر نیا آدم پیدا ہو جاتا ہے وغیرہ وغیرہ الغرض اس عقیدہ میں ایک بھی بات نہیں جو حکیم موصوف کے (فائیلو کے) معتقدات میں نہ آگئی ہو۔ اب اس مسیحی فلسفہ کے ساتھ مسئلہ کفارہ یعنی خدا کا انسانی گناہوں کے اُٹھانے کے واسطے زمین پر آنا (اور یہ بات بھی حکیم موصوف ہی کی ہے) اور داستانِ صلیب۔ پھر جی اُٹھنے کی کہانی اور آسمان پر چڑھ جانا۔ وہ کونسی بات اب باقی رہ گئی ہے جسے ہم

الہٰی الہام کی طرف منسوب کریں۔ حتیٰ کہ ایک قسم کی تثلیث تو حکیم **فائیلو** نے بیان کر دی ہے گذشتہ صفحات میں بھی ایک تثلیث کا ذکر کر آیا ہوں یعنی برس کی تین کیفیات یعنی برس کا پیدا ہونا۔ اُس کا مرنا۔ اُس کا پھر جی اُٹھنا اور اُس جی اُٹھنے کے ساتھ کل دنیا کو نئی زندگی بخشنا۔ یہ تو ایک قدیمی یونانی بُت پرستی کا عقیدہ تھا۔ مگر فیثا غورث نے ایک اور تثلیث کا پتہ دیا ہے جس کو قدیم سے کل یونانی حکماء نے تسلیم کیا ہوا تھا۔ اُس تثلیث کے تین **اقنوم** تھے (۱) خدا (۲) روح کائنات (۳) روح انسانی یہ بھی دراصل اُسی مسئلہ کلام تعلیم دادہ افلاطون کی دوسری شکل ہے۔ مگر حقیقت ایک ہی ہے اور حقیقت حقہ ہے۔ جیسے مَیں آگے چل کر بیان کروں گا لیکن مشرکانہ فطرت نے کہیں اُسے بُت پرستی کے رنگ میں دیکھا اور کہیں اُسے مسیحیت کی شکل دیدی حکیم **پلیوٹارک** ہمیں ایک اور تثلیث کا حوالہ دیتا ہے جو کہتے ہیں کہ جناب **زرتشت** نے تجویز کی تھی۔ اُس کے بھی تین اقانیم تھے۔ (۱) باپ (ایزد) جس سے **کل دنیا** نکلی (۲) متھرا سورج اور (۳) کائنات۔ یہ بات بھی صحیح ہے۔ اگر روحانی نظام میں فلسفہ کلام اپنے اصلی معنوں میں جیسا مَیں آگے چل کر بیان کروں گا۔ صحیح ہے۔ تو جسمانی نظام میں حضرت زرتشت کی مجوزہ تثلیث بھی درست ہے۔ نظام شمسی کی کل کائنات جو انسانی نگاہ میں ہے۔ وہ سورج ہی سے نکلی ہے گویا سورج ہی وہ چیز ہے

جس کو جسمانیات میں خدا تعالےٰ نے سب سے اوّل پیدا کیا ہے۔ پھر اسی سے کل کائنات بنی۔ لہٰذا بالفاظ استعارہ۔ اگر خدا سب کا **باپ** ہے۔ تو اس کا پہلوٹھا بیٹا، متھرا (سورج) ہے "ساری چیزیں اُس کے وسیلے سے پیدا ہوئیں اور جو کچھ پیدا ہوا ہے۔ اس میں کوئی چیز بھی اُس کے بغیر پیدا نہیں ہوئی"۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔ اب اگر ایک مشرک نگاہ، نیرّ اعظم ہی کو اپنا خدا اور ربّ مان لے تو کوئی عجیب بات نہیں لہٰذا انجیل یوحنا کی پہلی چند آیات مسیح یا کسی انسان پر تو مطلقاً نہیں۔ مگر سورج پر ہر معنوں میں ایک مشرکانہ خیال سے صحیح طور پر چسپاں ہوتی ہیں۔

"ابتداء میں کلام تھا۔ کلام خدا کے ساتھ تھا۔ اور کلام خدا تھا یہی ابتداء میں خدا کے ساتھ تھا۔ ساری چیزیں اُس کے وسیلے سے پیدا ہوئیں۔ اور جو کچھ پیدا ہوا ہے۔ اُس میں سے کوئی چیز اُس کے بغیر پیدا نہیں ہوئی"۔

انجیل یوحنا میں جس یونانی لفظ کا ترجمہ لفظ کلام کیا گیا ہے۔ وہ لفظ **لوگس** ہے۔ اس کے معنی صرف کلام ہی نہیں۔ بلکہ **خیال** اور اس کا اظہار یعنی کلام اور مفہوم کلام میں نے حکیم **فائیلو** کے ترجمہ اقتباسات بالا میں اگر لفظ کلام استعمال کیا ہے۔ تو صرف انجیلی ترجمہ کی رعایت سے کیا ہے۔ ورنہ حکیم موصوف کی تصنیف میں لفظ **لوگس** ہی آیا ہے۔ لفظ لوگس

سے اُن کی مُراد عقل یا ارادہ ہے۔ یہ مسئلہ دراصل پیدائش کائنات کے متعلق حکیم **افلاطون** کا نظریہ ہے۔ جسے حکمائے اسلام نے **عقل اوّل** سے تعبیر کیا ہے یعنی خدا تعالےٰ کا وہ ارادۂ ازلی جس میں کل کائنات کا ظہور اور اُس کی ترتیب تھی اور جس کے ماتحت یا مطابق کل دنیا پیدا ہوئی۔ اس امر سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ کہ ظہور کائنات سے پہلے ارادۂ الٰہی کا وجود ہوگا وہی ارادہ سب سے پہلے پیدا ہوا۔ اُسی سے ہر ایک چیز پیدا ہوئی۔ اُسی کا جلوہ ذرّہ ذرّہ میں ہے۔ انسان یا کوئی مخلوق جب تک اپنے حالات اُسی ارادۂ ازلی کے مطابق نہ کرلے۔ فلاح نہیں پا سکتا۔ لہذا وہی ازلی ارادہ بعبارت استعارہ خدا کا پہلوٹھا ہے۔ خدا کی طرف سے **مخلوق** پر حکمران ہے۔ اُسی سے کل دنیا بنی۔ جو کچھ دنیا میں ہے۔ اُسی کے وسیلے سے ہے۔ وہی دنیا کی روشنی ہے۔ وہی دنیا کا منجی ہے۔ وہی خدا کا ترجمان ہے۔ یعنی ذات ازلی کا مظہر اوّل اور مظہر کل۔ الغرض وہ ساری باتیں جو حکیم **افلاطون** نے عقل اوّل کے متعلق۔ **فائیلو** نے لوگس کے متعلق یوحنّا نے کلام کے متعلق اور کلیسیا نے مسیحؑ کے متعلق کہیں۔ وہ باتیں عقل اوّل۔ لوگس۔ کلام مسیحؑ پر منطبق ہوں یا نہ ہوں لیکن **ارادہ ازلی** ان سب پر حاوی ہے۔ دراصل خود حکیم افلاطوں پر بھی یہ حقیقت بیّن طور سے ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ وہ بھی خود کسی چیز کے نقش ذہنی اور اس کے خارجی ہونے کے چکر میں سرگرداں رہا معہود فی الذہن یا وجود خارج از ذہن کے

نظریئے اُس میں اور اُس کے شاگرد ارسطو میں باعث اختلاف ہوئے ان ذہنی پیچیدگیوں نے مسئلہ ارادہ ازلی کو بیّن طریق پر سمجھنے سے افلاطون کو قاصر رکھا۔ کچھ اُس کی کم وبیش مشرکانہ طبیعت بھی اصل حقیقت کے سمجھنے سے مانع ہوئی کیونکہ وہ زمانہ شرک ہی کا تھا۔ ان لوگوں کو اوّل تو حقائق بھی مشرکانہ رنگ میں نظر آرہے تھے۔ اور اگر صفائی دماغ نے حقائق کو اصلی رنگ میں دیکھ بھی لیا۔ تو جس زبان میں اظہار کرنا تھا وہ مشرکانہ تھی اُن کا مقصد خواہ کچھ ہی ہو۔ اُن کے کلام کو پڑھنے یا سننے والے سب کے سب مشرک ہی تھے۔ وہ ان کے خیالات کو تصویر یا بُت کی شکل میں ظاہر کرتے تھے۔ ان حکماء نے تو اس حقیقت **ارادہ ازلی** کا نام پہلوٹھا بیٹا۔ دنیا کی روشنی۔ مخلوق کا سبب خلق۔ ازلی وابدی وغیرہ وغیرہ رکھا۔ جن سے اُن کی مراد صرف اظہار مقصد تھی لیکن عوام نے ان نظریوں کو انسانی لباس پہنایا۔ بُت بنائے مصوری کے تمام فنون خرچ کردئے ایک حد تک یہ بھی درست تھا۔ اگر حقیقت سامنے رہتی اور یہ تصویریں اور مجسمے فقط **تشریح** سمجھے جاتے لیکن آنے والی نسلیں حقیقت سے الگ ہوکر ان مجسموں اور تصویروں کی پرستار ہوگئیں۔ ہندوستان کا بھی یہی حال ہوا۔ مغرب میں اسی مشرکانہ فطرت نے قدیمی حقائق حکیمانہ کو چوتھی یا پانچویں صدی پر مسیحؑ کی صورت میں پیش کیا۔ یہی زمانہ ہندوستان میں **پرانوں** کا زمانہ ہے۔ آج قریباً ڈیڑھ ہزار برس کے بعد ہندو تعلیم یافتہ اصحاب تو بُت پرستی

میں اِن حقائق بالا کو دکھاتے ہیں۔ وید کے معنی کرنے میں عناصر کے معانی صفات الٰہیہ کرتے ہیں۔ یہ سب صحیح۔ لیکن وہ خدا جس کی منشا کو اس طرح شرک اور بُت پرستی میں تبدیل کر دیا گیا۔ کیونکہ کروڑ در کروڑ ہندو۔ عیسائی پارسی ان تعلیم یافتہ اصحاب کی تشریحات کے قائل نہیں۔ اور ابھی تک اُسی بُت پرستی اور شرک میں مگن ہیں۔ وہ خدا کیوں ان انسانی تشریحات کا محتاج ہو۔ اور عین وقت پر حقیقت حال ظاہر نہ کرے۔ اگر ابتداء میں اُس نے یہ حقائق تعلیم کئے۔ تو جب اور جہاں بھی یہ حقائق شرک کے پردہ میں چھپ جائیں تو اُسی کا فرض ہے کہ نئے الہام کے ذریعے سے زمانہ کو پیدا شدہ غلطیوں سے پاک کرے۔ چنانچہ قرآن شریف کا یہی مذہب ہے۔ انبیاء بھی وقتاً فوقتاً اسی غرض کے لئے آئے۔ پھر سب کے بعد حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کاملہ بھی اسی غرض سے ہوئی۔ اس مسئلہ زیر بحث کو جس سے ہندوستان ایران۔ یونان۔ روما اور اُن کے بعد کل مغرب شرک میں مبتلا ہو گیا تھا۔ قرآن نے کیسے واضح الفاظ میں صاف کر دیا ہے۔ فرمایا۔ اذا ارادشیئ ان یقول لہ کن فیکون۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ فرماتا ہے۔ تو کہہ دیتا ہے کہ ہو بس وہ ہو جاتی ہے۔ اب اس حقیقت کا نام کچھ رکھو۔ اس آیت نے تو اُن پیچیدگیوں کو بھی صاف کر دیا ہے۔ جس میں افلاطون پھنسا ہوا تھا۔ اس آیت نے ارادہ۔ اظہارِ ارادہ اور ظہور ارادہ کو الگ الگ بیان کرکے اور سب کا فاعل ذاتِ باری کو بتا کر اس مسئلہ کو بچے بچے کے لئے بھی عام فہم کر دیا۔

فتدبروا یا اولی الالباب

مسیحی کلیسا کے معمار

خشت اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریّا می رود دیوار کج[1]

میں نے اپنی طبیعت کے خلاف تاریخ و حالاتِ کلیسا سے مجبور ہو کر اس باب کی افتتاح اس شعر سے کی ہے۔ کیونکہ اس شعر سے اس کلیسا کی کل کی کل حقیقت بالکل آشکارا ہو جاتی ہے۔ جو غلطی سے مسیح کے نام پر مشہور کیا گیا ہے مسیحؑ جیسے راستباز اور شریعت پر مُصر اور اُس کے پابند انسان کو جس کا ایک بھاری مشن منافقت کو فنا کرنا تھا۔ ایسی تعلیمات سے کیا تعلق ہو سکتا ہے جس کی پہلی بنیاد **پولوس** جیسے انسان نے ڈالی۔ پولوس کے دل و دماغ اور

---

[1] "جب معمار بنیادی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھتا ہے۔ تو وہ دیوار جو ثریا تک جائے گی ٹیڑھی ہی جائے گی"

اس کی نیت کی کیفیت کے اظہار کے لئے اس کا ایک ہی مقولہ کافی ہے۔ کتاب اعمال سے لے کر آخر تک کل پولوسی صحائف پڑھ جاؤ اس کے مختلف قول و فعل میں اسی مقولہ کے جلوے نظر آتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"میں یہودیوں کے لئے یہودی بنا۔ تاکہ یہودیوں کو کھینچ لاؤں۔ جو لوگ شریعت کے ماتحت ہیں اُن کے لئے میں شریعت کے ماتحت بنا۔ اگرچہ خود شریعت کے ماتحت نہ تھا۔ اور بے شرع لوگوں کے لئے بے شرع بنا۔ تاکہ بے شرع لوگوں کو کھینچ لاؤں۔ کمزوروں کے لئے کمزور بنا۔ تاکہ کمزوروں کو کھینچ لاؤں۔ میں سب آدمیوں کے لئے سب کچھ بنا ہوا ہوں تاکہ کسی طرح سے بعض کو بچاؤں اور میں سب کچھ انجیل کی خاطر کرتا ہوں تاکہ اوروں کے ساتھ اس میں شامل ہوں"

آج اگر مغرب کے فضلائے مسیحیت اس کلیسیا سے الگ ہو گئے جسے ان فقرات کے بولنے والے انسان اور اُس کے متبعین نے تیار کیا تو انہوں نے اپنی دیانت وامانت کا ثبوت دیا ہے۔ آج اگر اسقف اعظم آرچ بشپ پارک نے جرات سے یہ کہا ہے کہ ہمارا کلیسیا **نفرت انگیز** ہے۔ تو اُس نے حقیقت کا ہی اظہار کیا ہے۔ میرا دل تاریخ کلیسیا پڑھ کر خون ہو جاتا ہے۔ ایسے مذہب کے لئے جسے مسیحؑ سے کوئی تعلق نہ ہو۔ جیسے کہ آج فضلائے مسیحیت نے مان لیا۔ اور جس کی ترمیم و تعمیر ہر وقت ضرورتِ زمانہ یا وقتی

متدائرہ خیالات کے مطابق ہوتی رہی ہو۔ خواہ وہ خیالات غلط ہوں یا صحیح۔ کروڑہا انسان گذشتہ پندرہ صدیوں میں حوالہ کشت وخون ہوں۔ علم وفضل کا قلع قمع کیا جائے۔ ہر تحریک تہذیب وتمدن کو دبایا جائے۔ اور پھر اسی مذہب پر آج کروڑوں پونڈ پانی کی طرح بہائے جا رہے ہیں۔ کس قدر ظلم ہے کہ جس مذہب کو جس کلیسیا کو یہ اہل مغرب خود چھوڑتے ہیں۔ اُس کے جوئے کے تلے مشرق کو لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پھر اس کام کے کرنے والے اور اس میں امداد دینے والے وہ لوگ جو خود اس سے متنفر کتاب کو تو خود محرف ومشتبہ اس کے بعض حصص کو داستانِ اکاذیب قرار دیں۔ اُس کی صحت پر حلف لینے سے اُن کے بڑے پادری **کنٹربری** کے جلسہ عام میں انکار کریں اور اسی غرض سے **مقررہ حلف** کلیسیا کو بدل دیں۔ پھر اسی کتاب کو کروڑوں کی تعداد میں چھاپ کر دُنیا میں شائع کریں۔ خود تو مختلف کونسلیں کر کے اس فکر میں لگ جائیں کہ پُرانے عقائد کی جگہ نئے عقائد تجویز ہوں اور گزشتہ ۲۳۔ جولائی ۱۹۲۳ء کو برسٹل میں بصدارت آرچ بشپ کنٹربری اس لئے جمع ہوں کہ کس طرح عیسائیوں کو عیسائی رکھا جائے۔ کس طرح خالی شدہ گرجوں کو معمور کیا جائے لیکن اُسی جلسہ میں ہمارے متعلق یہ کہا جائے کہ آج اسلام کے پچاس بڑے شہروں میں سے چالیس شہر ہمارے حلقہ اثر میں ہیں اور اسلام عیسائیت کے لئے نو توڑ زمین ہے :-

پولوس نے خود جناب مسیحؑ سے کوئی فیض نہیں پایا۔ اُن کی (مسیحؑ کی) زندگی میں وہ اُن کا ایک جانی دشمن تھا۔ اُن کی ایذا رسانی میں اُس نے کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ جناب مسیحؑ کے بعد وہ حواریوں کے پاس آتا ہے۔ اور ایک رویا کا قصہ سناتا ہے۔ اپنے آپ کو مسیحؑ کا خادم ظاہر کر کے یہودا اسکریوطی کی خالی شدہ جگہ اپنے لئے تجویز کرتا ہے۔ میں اس کی نیت پر حملہ نہیں کرتا۔ اُس کے اعمال ہی اس کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ جو کچھ یہود اسکریوطی نے مسیحؑ کے ساتھ زندگی میں کیا وہی اُس کے جانشین پولوس نے آپ کے بعد آپ کے مذہب کے ساتھ کیا۔ پولوس جس جماعت کو چھوڑ کر مسیحؑ کے مریدوں میں آملا تھا۔ وہ اُس کی طبعًا دشمن ہو گئی۔ یہودی اس کو نفرت سے دیکھنے لگے۔ پولوس کے لئے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ کہ مختونوں کو چھوڑ کر وہ غیر مختونوں یعنی یونانیوں۔ رومیوں میں اپنی جگہ بنائے۔ وہ لوگ نہ شریعت کے پابند نہ شرعی احکام سے تعلق رکھنے والے۔ جو سامنے آجائے۔ کھا جانے والے۔ خنزیر کا گوشت ہو یا چڑھاوے کا گوشت۔ پولوس نے یہ سب جائز کر دیا۔ شریعت کے احکام توڑ دیئے۔ وہ مجبور تھا۔ کیونکہ یونانی قیود شرعیہ قبول نہ کر سکتے تھے۔ سب سے بڑھ کر وہ غیر مختونوں کو مسیحی مذہب میں لا ہی نہ سکتا تھا۔ مسیحؑ کی تعلیم اُس کا عمل اُس کے خلاف تھا۔ پولوس کی ان حرکات سے حواری گھبرائے۔ اُس کو ان باتوں سے روکا۔ مگر وہ کب رُکنے والا تھا۔ انہیں گول مول جواب دیا۔ آخر کار بصد اصرار

یہودیہ میں آیا۔ ایک مجلس اس لئے قائم ہوئی۔ کہ پولوس اپنی صفائی پیش کرے فریسی اور صدوقی فقیہ بھی جمع ہوئے۔ وہ لوگ پولوس سے کچھ ایسے متنفر تھے کہ اُس کی شکل دیکھتے ہی بعض فریسی شور و غل کرنے لگے۔ پولوس تو ایک موقعہ شناس انسان تھا۔ ایک شوشہ چھوڑ کر فریسی اور صدوقیوں میں فساد ڈالوا دیا اور آپ چلتا بنا۔ اس واقعہ کے بعد پولوس کا میدانِ عمل زیادہ تر یونانی اور رومیوں میں ہی محدود ہو گیا۔ جن کی روایات عقائد۔ خیالات اور طرزِ عمل کے مطابق پولوس نے مسیحؑ کے نام پر ایک نیا مذہب تیار کر دیا۔ ڈین انجی اور اس کے رفقا اگر اس نتیجہ پر آگئے۔ کہ مسیحؑ کے نام پر جو کلیسیا آج قائم ہے وہ بنا کردہ مسیحؑ نہیں۔ تو ایک صحیح نتیجہ ہے۔

میرے نزدیک تو یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ یہ کلیسیا پولوس کا بنایا ہوا ہے ابتدائی صدیوں میں معلمان کلیسیا کا یہ ایک مسلمہ طریق تھا۔ کہ جب کوئی نئی بات بنائی۔ یا وقتی ضرورت کے دفعیہ کے لئے کوئی نیا مسئلہ ایجاد کیا۔ تو اُسے ایک کتاب یا صحیفہ کی شکل میں لکھ کر کسی مقتدر معروف نام پر شائع کر دیا۔ پولوسی تصانیف کی حقیقت آج یہی مانی جاتی ہے۔ لیکن ہمیں اس سے بھی بحث نہیں۔ پولوس ہو یا کوئی اور راہب ان سب نے پولوس کے اقوال مندرجہ بالا پر عمل کیا۔ " کہ میں بے شرع لوگوں کے لئے بے شرع بنا۔ تاکہ بے شرع لوگوں کو کھینچ لاؤں۔ میں کمزوروں کے لئے کمزور بنا ..... میں سب آدمیوں

کے لئے سب کچھ بنا ہوا ہوں...... میں سب کچھ انجیل کی خاطر کرتا ہوں۔"
ان الفاظ کا صاف اور موٹے الفاظ میں ترجمہ یہ ہو سکتا ہے کہ میرا نہ کسی مذہب سے تعلق ہے۔ نہ کسی شریعت کی پابندی ہے نہ کسی کمزوری کی مجھ کو پرواہ ہے۔
غرض مسیحؑ کو منوانا ہے خواہ کسی طرح سے ہو ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریّا می رود دیوار کج

یہی وہ خشت اوّل ہے جو کج رکھی گئی اور وہ یہ تھی کہ مسیحی مذہب کو ہردلعزیز کرنے کے لئے یا اپنی ذاتی اغراض پوری کرنے کے لئے مسیحؑ کے نام پر ہر ایک عقیدہ مقبولہ یا روایات متداثرہ کو خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط کلیسیا میں داخل کر لیا جائے۔ اسی پر ہر آنے والی راہبوں کی نسل نے عمل کیا۔ **نیقہ** کی کونسل نے **اثھونوشیا** نے۔ **شاہ قسطنطین** غرض سب نے یہی طریق اختیار کیا۔ آج بھی علی الاعلان یہی ہو رہا ہے۔ پرانے مشکیزہ میں نئی شراب بھری جا رہی ہے۔ فرق یہ ہے کہ پرانے معمارانِ کلیسیا تو کسی قدیم مقتدر نام پر نئی عمارت کھڑی کرتے تھے۔ آج کل کے معماروں کی دیانت نے اُنہیں اس بات پر مجبور کیا۔ کہ پرانی عمارت کو علی الاعلان بیخ وبن سے اُکھاڑ کر اُس کی جگہ نئی عمارت کھڑی کر دیں۔ وہ نہیں جانتے کہ اگر مذہب خدا کی طرف سے ہے اور اُسی کا بنایا ہوا ہے تو انسانی ہاتھ ربّانی عمارت کو نہیں بنا سکتے۔ اگر

خدا تعالیٰ نے ہر ایک ضرورت کے وقت ربّانی ہیکل (مذہب حقہ) کی شکست و ریخت کو اپنے معماروں (انبیاء) کے ہاتھوں درست کرایا۔ تو جس ٹوٹی ہوئی ہیکل کو مسیحؑ درست کر کے چھوڑ گیا تھا اور وہ پانچویں صدی میں بالکل برباد ہو چکی تھی۔ اس درستی کے لئے عین اُسی وقت کیوں کوئی ربانی معمار نہ آتا۔ خدا نے اپنی سنت قدیمہ کے مطابق نبوت کی اُس آخری **اینٹ** کو بھیجا جس نے عمارتِ مذہب کو ہمیشہ کے لئے مستحکم کر دیا۔ آج جن جن عقائد کو چھوڑا گیا ہے۔ اور غلط سمجھا گیا ہے۔ وہ سب کے سب پانچویں چھٹی صدی میں پیدا ہو چکے تھے۔ پھر ان باتوں کو چھوڑ کر، اُن کی جگہ جو مذہب تجویز ہو رہا ہے۔ اس کی بہترین شکل **اسلام** ہے چھٹی صدی میں خاتم النبیین حضرت محمد صلعم نے وحی الٰہی کے ماتحت مبعوث ہو کر مسیحی عقائد کے متعلق وہی کہا۔ جو آج تیرہ ۱۳ سو برس بعد فضلائے مسیحیت کہتے ہیں اور دنیا کو ایک بہتر سے بہتر مذہب دے گئے۔ لیکن مشکل تو یہ آن پڑی کہ عیسائیت آج صرف مذہب ہی نہیں بلکہ اس کے نام تلے مغربی اقوام کی بہت سی سیاسی اغراض کا نفاذ ہوتا ہے۔ اس لئے نام تو عیسائیت ہی رکھا جائے گا۔ گو اس نام تلے کل اسلامی تعلیم آجائے۔ نماز کی صورت تو وہی رہے گی۔ گو تحمید، تسبیح اسلامی ہو جائے"

جس وقت عیسائی مذہب کا مغرب میں ظہور ہونے لگا۔ اس وقت بحیرۂ روم ایک جھیل کی صورت تھا۔ جس کے ارد گرد کے متمدن ممالک میں ایک ہی مذہب

مختلف شکلوں اور ناموں میں دائر و سائر تھا۔ یہ مذہب ۔ مذہب شمس پرستی تھا۔
متھرا۔ بعل۔ اطیس۔ بیکس۔ ایڈونس۔ ہرکلیس۔ اپالو۔ ہورس۔ آسیرس یہ سب کے سب سورج دیوتا ہی کے نام تھے۔ ان سب کی پیدائش کنواری کے ہی بطن سے ۲۵ سے لے کر ۲۸ دسمبر کی کسی تاریخ کو مانی ہوئی تھی۔ ان کی ذات کے ساتھ کسی نہ کسی رنگ میں بارہ[۱۲] کے عدد کا تعلق تھا۔ بعض کے بارہ[۱۲] شاگرد یا دوست۔ بعض کے بارہ[۱۲] کارنامے۔ بعض کی بارہ[۱۲] سفرگاہیں (بروج) تھیں۔ ان کی زندگیاں کل کی کل نسل انسانی کے فائدہ اور اس کی نجات میں گذریں۔ ان سب نے انسانی نجات اپنی موت سے کی۔ چنانچہ وہ مصلوب یا مقتول ہوئے۔ تاریخ موت بھی وہی اخیر مارچ یا **گڈ فرائی ڈے** کے قریب قریب ہے۔ اُن میں سے اکثر قبر میں بھی دو ہی دن رہ کر بعد میں جی اُٹھتے ہیں جی اُٹھنے کا دن بھی وہی **ایسٹر** کا دن ہے۔ ان باتوں کو میں تفصیل کے ساتھ اپنے مقام پر بیان کر آیا ہوں۔ یہاں تو میں نے استحضاراً ان باتوں کا پھر ذکر کیا ہے۔ ہاں! عیسائی دوست اس ایک بات پر ہی غور کریں کہ **گڈ فرائی ڈے** یا **ایسٹر سنڈے** کیوں ایک تاریخ پر ہر سال نہیں آتے کیوں ان تاریخوں کی تعیین قمری گردش کے ماتحت رکھی گئی ہے۔ یہ تو وہی موسم بہار کی کیفیات ہیں وہی مری ہوئی زمین کے جی اُٹھنے کی تاریخ ہے۔ جس کے ساتھ کل دُنیا دوبارہ زندہ ہوتی ہے۔ جس واقعہ کے ساتھ اگر آفتاب کو تعلق ہے۔ تو ماہتاب کو بھی اُس سے کم تعلق نہیں ؛

ایک طرف تو ولادت گاہ مسیحؑ کے اردگرد ممالک میں یہ عقائد پھیلے ہوئے تھے۔ اور اُن سب مذاہب میں سے جو دراصل ایک ہی مذہب کی مختلف شکلیں تھیں **متھرا مذہب** اُس وقت سب پر غالب تھا۔ اُس کے تمام پر **بپتسمہ** اور **عشاءِ ربانی** کی رسم بھی قبل از مسیحؑ صدیوں پہلے ادا ہوتی تھی۔ دوسری طرف فلسفی دُنیا میں مسئلہ کلام (**لوگس**) مرغوب تھا جس کی تشریح میں بیان کر چکا ہوں۔ تیسری طرف یہودی مذہب تھا جس کے پرستار قریب قریب ہر متذکرہ بالا ممالک میں موجود تھے۔ الغرض مذہب اور فلسفہ کی یہ تین نہریں بحیرہ روم کے اردگرد کے ملکوں میں جاری تھیں۔ معمارانِ مسیحی کلیسیا نے اپنی کامیابی اسی میں دیکھی کہ ان تینوں مذاہب میں سے کچھ کچھ مصالح لے کر ایک مذہب کی عمارت تیار کر لی جائے۔ جس میں ان ہر سہ جماعتوں کے معتقدات کا لحاظ رہے۔ یہودیوں کو تو یہ کہا گیا۔ کہ جس اسرائیلی قوم کے منجی اور ابنِ داؤد کے تم منتظر تھے۔ وہ یہی **ابن مریم** ہے اس ایک بات کے سوا باقی کل یہودی مذہب کو قریب قریب چھوڑ دیا گیا۔ کیونکہ شریعت کی پابندی باقی کل اقوام کے مذاق کے مطابق نہ تھی۔ وہ تو ہر قسم کی قیود شریعت سے آزاد تھے اور یہودی کل کے کل مرہون شریعت تھے۔ دوسری طرف **متھرا** پرستی کی ہر ایک چیز مذہب میں داخل کر لی گئی دراصل وہی تعلیم مسیحؑ کی قائم مقام ٹھہری۔ حتیٰ کہ مسیحؑ کا صرف نام ہی نام رہ گیا۔ قسطنطین اور اُس کے ہمنواؤں نے مسیحؑ کو

متھرا یا اُس کے جانشین اپالو کی کرسی پر بیٹھا کر شاہیت کی کل کی کل روایات اور رسمیات مسیح کے نام پر منتقل کر دیں فلسفی مزاجوں کے مذاق کو صرف اسی طرح پورا کر دیا کہ "لوگس" کا سایہ کا سارا فلسفہ لے کر **کلام** کا مجسمہ مسیح کو بنا دیا۔

شاہ قسطنطین کے سامنے تبدیلی مذہب کی جو ایک خاص پولیٹیکل غرض تھی وہ قریب قریب دو تین نسلوں سے ہر ایک قیصر روم کے مدنظر رہی۔ رومی سلطنت کے ماتحت مختلف قومیں تھیں۔ جن کے مذہب و رسم و خیال ایک دوسرے سے جداگانہ تھے۔ قیصران روم اس فکر میں ہمیشہ سے رہے کہ اُن کی کل کی کل رعایا مذہبی معاملات میں بھی ایک قسم کی یک رنگی اختیار کر لے چنانچہ وہ نہ اپنی رعایا کے مذہبی نکتہ سے آگاہ ہوئے اور مختلف مذاہب میں مذہبی ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش میں رہے۔ رومی سلطنت ہر ایک مذہب کے معبود کے لئے سرکاری خرچ پر مندر بھی بنوا دیا کرتی تھی۔ قیصر **ہیڈرین** اپنے وقت کا ایک ذی علم بادشاہ تھا۔ وہ نہ صرف اپنی عالمگیر سلطنت کے مذاہب مختلفہ کے اصول سے ہی واقف تھا۔ بلکہ وہ بعض مذاہب کے فرقہ ہائے باطنیات میں شریک بھی ہو جاتا تھا۔ اسرائیلیوں کے سوا باقی کل کی کل رعایا دراصل سورج پرست ہی تھی۔ لیکن ہر ایک قوم نے اپنے سورج دیوتا کا نام ایک خاص رکھا ہوا تھا جن کے مندر الگ الگ موجود تھے ہیڈرین کے وقت عیسائی لوگوں کی بھی ایک کافی تعداد ہو چکی تھی۔ **شاہ نیرو** کا ظلم اس جماعت کو دبا نہ سکا۔

بلکہ اس ظلم کے بعد عیسائی تعداد میں بڑھ گئے۔ اس لئے ہیڈرین کا یہ پختہ خیال تھا۔ کہ" وہ مسیحؑ کے نام پر ایک مندر بنائے اور مسیحؑ کو رعایا کے دوسرے معبود دیوتاؤں کی فہرست میں داخل کرے" (ملاحظہ ہو (LAMPIDIUS 43 : 1 ہیڈرین جو بات خود نہ کر سکا۔ اُسے اُس کے جانشین قسطنطین نے پورا کر دیا۔

میں نہایت ادب اور سچے اخلاص سے (اور اس امر کا شاہد بھی خدا تعالیٰ ہے) عیسائی دوستوں کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔ کہ وہ کلیسیا کے کسی عقیدہ۔ کسی روایت۔ کسی اصطلاح کا نام لیں۔ اور وہ دیکھ لیں۔ کہ ان کا ماخذ شمسیت یا فلسفہ اسکندریہ ہے کہ نہیں ہے اور بالضرور ہے۔ میں مانتا ہوں اگر وہ اس وقت تک عیسائی ہیں تو نہایت نیک نیتی سے اپنے مذہب پر قائم ہیں۔ انہوں نے لاعلمی میں جو باتیں صحیح سمجھیں۔ آج اگر وہ اصلی روشنی میں آگئے ہیں۔ (اور وہ ایک بت پرستی کا بقیہ ہیں) تو اُسے چھوڑ دینے میں تامل نہ ہونا چاہیئے۔ وہ ان عقائد اور روایات کو چھوڑ کر مسیحؑ کو نہیں چھوڑتے یہ روایات مسیحؑ کی تو نہیں۔ یہ تو **بعل۔ منتھرا** اور **اپالو** کی ہیں۔ اگر مغرب میں فضلائے مسیحیت نے نہایت جوانمردی سے ان عقائد کو چھوڑ دیا ہے۔ تو مشرق والوں کو بھی پیروی میں کچھ عذر نہ کرنا چاہیئے۔ مسیحؑ ایک سچے مسلم پیغمبر تھے۔ خدا کے پیارے نبی

اور ہمارے متبوع۔ وہ اسلام ہی دنیا میں لائے۔ پہاڑی خطبہ کا لفظ لفظ اس پر شاہد ناطق ہے

"یہ نہ سمجھو کہ میں شریعت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین نہ ٹل جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت سے نہ ٹلے گا۔ جب تک سب پورا نہ ہو جائے۔ پس جو کوئی ان چھوٹے سے چھوٹے حکموں میں سے بھی کسی کو توڑے گا۔ اور یہی آدمیوں کو سکھائے گا وہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے چھوٹا کہلائے گا۔ لیکن جو اُن پر عمل کرے گا۔ اور ان کی تعلیم دے گا۔ وہ آسمان کی بادشاہت میں بڑا کہلائے گا۔ (متی ب ۵ آیت ۱۷ تا ۱۹)

خدا کے احکام یا شریعت پر چلنا ہی اسلام ہے۔ آسمان کی بادشاہت میں بقول مسیحؑ وہی چھوٹا کہلائے گا۔ جو شریعت پر عمل نہ کرے اور وہی بڑا کہلائے گا جو شریعت پر عمل کرے گا یا اُسے سکھائے گا۔ بالفاظ دیگر مسلم یا معلم اسلام ہی جنتی ہے۔ جناب مسیحؑ دُنیا میں اسلام ہی سکھلانے آئے۔ مذہب محبت جو آج مسیحؑ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ اِسلام ہی ہے۔ ہاں! وہ (مسیحؑ) اس مذہب کی پوری تعلیم نہ کر سکے۔ وہ اس مذہب کی شرائع یا حدود بیان نہ کر سکے۔ مذہب

حقہ کی علّت غائی ہی خدا اور مخلوق سے محبّت ہے۔ جناب مسیحؑ نے بھی اس پر زور دیا۔ مگر وہ تکمیل تعلیم نہ کر سکے۔ چنانچہ ان کو اس بات کا خود بھی اعتراف ہے۔ وہ فرماتے ہیں ”مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں۔ مگر اب تم اُن کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب روحِ حق آئے گی۔ تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گی۔“ بہرحال یہ بات توصاف ہے کہ مسیحؑ مذہب کو نامکمل چھوڑ گئے۔ اور مذہب کی تکمیل کسی آئندہ الہام و نبوت سے وابستہ کر گئے۔ تعصب یا خوش فہمی نے اُس آنے والی روح کا ظہور اُس کلیسیا کے وجود میں دیکھا جسے قدیمی راہبوں نے مسیحؑ کے نام پر قائم کیا تھا۔ وہ کلیسیا آج ٹوٹ گیا۔ اس کی تعلیم کا ماخذ انسانی دماغ نکلا۔ خواہ وہ کسی مفکر ابرپرست کا دماغ ہو یا فائیلو کا۔ وہ روح القدس کی باتیں نہ تھیں۔ اور خدا اپنی سنت مستمرہ کے خلاف بھی کیسے کرتا۔ اُس کی (خدا کی) تعلیم ہمیشہ کسی برگزیدہ انسان کی معرفت آئی۔ روح القدس ہمیشہ ایک وقت ایک ہی انسان کی معرفت بولی۔ لیکن مسیحؑ کے بعد ہمیں یہ کہا گیا۔ کہ اب روح القدس ایک جماعت کے ذریعے سے بولے گی۔ جس کا نام کلیسیا ہے۔ بہرحال یہ بھی قدیمی راہبوں کی ایک تجویز تھی جس کے ذریعہ انہوں نے اپنی باتوں کو مقدس اور محترم بنانے کے لئے یہ مسئلہ بنایا کہ کلیسیا جو کچھ کہتا ہے وہ روح القدس سے بھرپور ہو کر کہتا ہے۔

خدا تعالےٰ نے اپنی سنت قدیمہ کے مطابق عین اُس وقت جب مسیحی

تعلیم کو پولوسیوں نے تباہ کر دیا۔ اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہوئے عرب[۱] کو نبوت دی۔ وہی نور جو سینا سے نکل کر سعیر سے طلوع ہوا۔ وہی وادئ فاران (مکّہ) سے اپنی پوری شعاعوں کے ساتھ ظاہر ہوا۔[۱] اُس نے مسیح[۲] کا جلال ظاہر کیا۔ مسیح[۲] کی ذات سے دشمنوں کے الزام دور کئے۔ اس کی صحیح تعلیم کو غلطیوں سے پاک کرکے اس مذہب کے بھی صحیح قوانین وحدود بنا گیا۔ جسے آج مسیح[۲] کے نام پر بنانے کی تجویز ہو رہی ہے یعنی **مذہب محبّت** جسے یہاں میں برعایت اختصار لکھ دیتا ہوں۔ تفصیل کے لئے تو ایک مستقل کتاب چاہیئے۔

---

[۱] استثنا ۳۳/۲-۵ پیدائش ۲۱/۲۱ یسعیا ۲/۱ یسعیا باب ۲۱

اِسلام
یا
مذہبِ محبّت

اس موضوع پر کچھ لکھنے سے پہلے مَیں اوّلاً مذہب اور اُس کے مقصد پر چند الفاظ لکھنا چاہتا ہوں۔ مذہب کی حقیقت و غائت کے نہ سمجھنے نے دنیائے مذہب میں مختلف مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ اسی سے طرح طرح کے غلط عقائد اور اُن سے غلط اصول تمدّن و تہذیب پیدا ہو گئے۔ قرآن نے جس مذہب کا نام اسلام رکھا ہے۔ وہ ان قوانین الٰہیہ کی اطاعت ہے جن سے انسان کے ودیعت شدہ اور مضمرہ قوے چمک کر بلوغت کو پہنچ جاتے ہیں۔ از روئے تعلیم قرآنی محض سجدہ و رکوع کرنا۔ چند فقروں کا زبان پر لانا۔ چند باتوں کو مان لینا مذہب نہیں۔ یہ باتیں اجزائے

مذہب تو ہیں مگر عین مذہب نہیں۔ مذہب تو زندگی کا وہ صحیح نظریہ ہے کہ جس کو عمل میں لانے سے انسان وہ چیز بن جاتا ہے جس کے لئے کہ وہ بنایا گیا۔

کائنات میں ایک چیز بھی تو ایسی نہیں جس میں گوناگون استعدادیں مخفی نہ ہوں اُن کے پنپنے کے لئے خاص خاص لاتبدیل قواعد مقرر ہیں۔ جن سے تمسک کر کے ہر ایک چیز اپنی مخفی استعدادوں کو ظہور میں لے آتی ہے انہی لاتبدیل قوانین الٰہیہ پر چلنے کا نام اِسلام ہے۔ کسی درخت کا تخم لے کر دیکھ لو۔ اگر کوزے میں دریا بند ہو سکتا ہے۔ تو پھر وہی تخم ہے۔ ایک رتی بھر چیز اور اس میں ایک بڑا تناور درخت۔ شاخیں۔ پتے۔ پھل۔ پھُول۔ رائحہ ذائقہ اور نہ معلوم کیا کیا کچھ بھرا پڑا ہے۔ قدرت نے اس تخم کو درخت بنانے کے لئے چند قوانین وضع فرما دئے ہیں جس وقت اُن کی اطاعت ہوئی وہ تخم درخت ہو گیا کائنات کی ہر ایک چیز کا یہی حال ہے ان سب کا ایک ہی مذہب ہے۔ یعنی اپنے متعلقہ قوانین پر چل کر اپنے کمال پر پہنچ جانا۔ اسی کا نام لفظاً اور معناً اِسلام ہے انسان کے اندر لاانتہا استعدادوں کا خزانہ ہے۔ اس کا جسم اُس کے جذبات۔ ادراک۔ تعقل۔ ارادہ۔ تصوّر وغیرہ۔ پھر ان کے صحیح استعمال سے اُس میں قوت صنعت و ایجاد۔ تصنیف و تالیف۔ مختلف علوم و فنون۔ پھر جذبات کا صحیح شکل میں عمدہ اخلاق میں آجانا۔ اخلاق فاضلہ۔ روحانیات وغیرہ۔ غرض یہ سب کچھ انسان

کے اندر ہیں کسی سے کسی کا اور کسی میں کسی کا ظہور ہوتا ہے۔ لیکن ان میں سے ہر ایک چیز کے ظہور کا ایک ہی بہترین صحیح و لاتبدیل طریق ہوتا ہے جس پر چلنے کا نام **اسلام** ہے۔ خواہ وہ جسمانیات سے تعلق رکھے یا روحانیات سے۔

ایک جسم انسانی کی صحیح پرورش کے لئے ہمیں کائنات کی ہر ایک چیز سے تمسک کرنا پڑتا ہے جن کے متعلق پھر الگ الگ قوانین ہیں۔ یہ جو طرح طرح کی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہے۔ وہ انہی قوانین کی خلاف ورزی سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ لہذا عالم جسمانیات کے قوانین کا دریافت کرنا اور اُن پر چلنے کا نام بھی جہاں تک جسمانیات کا تعلق ہے۔ **اسلام** ہی ہے۔ اس لئے سائنس کی مختلف شاخوں میں جس قدر تحقیق سے نئے علوم پیدا ہوتے رہتے ہیں اگر وہ صحیح ہیں تو وہ سب کے سب **اسلام** ہی کے علوم ہیں۔ یہ میں نہیں کہتا خود قرآن مجید کہتا ہے۔ ولہ اسلم من فی السمٰوات و الارض۔ ہر ایک چیز جو زمین اور آسمان میں ہے۔ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے آگے سر جھکاتی ہے۔ اس کی بقا اُس کے خواص کا ظہور۔ ان قوانین کی پیروی پر منحصر ہے۔ انہی قوانین کی دریافت کا نام سائنس ہے سائنس کیا ہے؟ دراصل اس ارادہ الٰہیہ کا علم حاصل کرنا ہے جو کائنات کی کسی چیز کے خلق۔ اُس کے خواص اور اُن خواص کے طریق ظہور کے متعلق ہو۔ اسی وجہ سے میں نے اسے بھی علوم اسلام کی ایک شاخ قرار دیا ہے۔

ہماری تحقیقات جسمانیات میں بھی جو تجربہ اور مشاہدہ سے تعلق رکھتی ہے غلطی سے خالی نہیں ہوتی۔ پھر ذہنیات۔ اخلاق اور روحانیات تو کل کی کل نظریات ہیں۔ ان میں تو قدم قدم پر غلطی کا احتمال ہے۔ اس لئے مصلحت ربی نے ان آخر الذکر علوم کو بذریعہ وحی انسان پر القا کیا۔ لہٰذا ان القا شدہ باتوں کی حقیقت سمجھنا اور اُن پر چلنا، مخصوصی معنی میں **مذہب اسلام** کہلاتا ہے۔

ان باتوں سے ظاہر ہو گیا ہوگا۔ کہ مقصد مذہب از روئے تعلیم قرآن مخفی قویٰ کا ظہور اور ان کا کمال پر پہنچانا ہے۔ پھر جب ہر ایک چیز اپنے کمال پر پہنچنے کے لئے صدہا قوانین کی پیروی کی محتاج ہے۔ تو انسان جو ایک قسم کا عالم صغیر ہے۔ اور کائنات کی کل قوتیں استعداداً اپنے اندر رکھتا ہے۔ وہ بغیر کسی قانون اور اطاعت قانون کے کس طرح اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکتا ہے؟ کسی بزرگ کے چند اخلاقی فقرے چند دعائیں۔ اُس کے منہ سے نکلی ہوئی چند لعنتیں یا چند معجزات مذہب حقہ کی تکمیل نہیں کر سکتے۔ اسی طرح چند امور پر خواہ وہ صداقت ہی کیوں نہ ہوں ایمان لانا اور ان پر عمل پیرا نہ ہونا کسی نتیجہ کو پیدا نہیں کر سکتا اگر اس بات پر ایمان لانے سے کہ فلاں خزانہ میں اس قدر زر و مال ہے۔ کوئی شخص دولتمند نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ اپنے قویٰ کو صحیح طور پر استعمال نہ کرے۔ تو پھر خون مسیحؑ یا کسی

ایسی بات پر صرف ایمان رکھ لینے سے فطرت انسانی کے مخفی جوہر نشو و نما نہیں پا سکتے۔ یہ نظریہ ہی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ خود عشاء ربانی کے مسئلہ کو دیکھا جائے۔ اس کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ جس وقت ایک پرستار صدق دل اور صحیح اعتقاد سے شراب کا ایک قطرہ اور روٹی کا ایک ٹکڑا جسے باپ بیٹے کے نام پر تقدیس دی گئی ہے۔ حلق سے اُتارتا ہے تو مسیحؑ میں اور اُس میں ایک قسم کی وحدت پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ اس رسم کا نام **ہولی کمیونین** (مقدس اتحاد بالذات) اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس روحانی اتحاد کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ اس سے انسان کی فطرت گناہ مرجاتی اور اُس کو راستباز انسان بنا دیتی ہے۔ بات تو واقعی اعجاز کی ہے۔ اور عیسائی عقیدہ بھی یہی ہے۔ کہ یہ **ہولی کمیونین** کی رسم جو خون مسیحؑ کی یاد میں ہر اتوار کو گرجوں میں منائی جاتی ہے۔ اعجاز فطرت میں تبدیلی پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن نہایت مایوسی اور افسوس سے کہا جاتا ہے کہ اس اعجاز کا گذشتہ دو ہزار سال میں کوئی عملی ثبوت نہیں ہوا۔ اس قسم کے عقیدوں سے کونسا کفر و الحاد کا مذہب خالی ہے؟ اوّل تو یہی عشائے ربانی کی رسم مسیحؑ سے ہزاروں برس پہلے من وعن اسی طریق پر۔ اسی شکل میں متھرا کے خون کی یاد میں منائی جاتی تھی۔ جیسا کہ لکھ آیا ہوں۔ پھر ہندوستان میں بُت پرستی کا کونسا مندر ہے جہاں دیوتا کو اشیائے خوردنی سے بھوگ نہیں

لگایا جاتا۔ اور پھر بھوگ کی اسی طرح تقدیس و تکریم کی جاتی ہے جیسے عشائے ربانی میں شراب و روٹی کی پھر بھوگ کا لقمہ جس کے حلق سے اُتر جائے۔ اُس میں اور اُس دیوتا میں وحدت ذاتی تسلیم کی جاتی ہے۔

الغرض اِن باتوں کی حقیقت ایک داستان سے زیادہ نہیں۔ انسان کا صحیح مذہب وہی ہے جو کائنات کے ذرہ ذرہ کا ہے جس طرح کسی درخت کے تخم میں ہزارہا ان گنت جوہر مضمر ہوتے ہیں۔ اسی طرح بے تعداد استعدادیں نطفۂ انسانی میں پنہاں ہیں۔ اگر ایک تخم مقررہ قوانین اور راہوں پر چلنے ہی سے ایک باثمر درخت بن جاتا ہے۔ تو انسانی جوہر بھی صحیح قوانین الٰہیہ پر چلنے سے ہی بار ور ہوتے ہیں۔ اگر یہ طریق غلط ہے اور صحیح طریق وہی ہے جو مسیحیت تجویز کرتی ہے یعنی یہ کہ صرف ایمان لانے سے ہی انسان نیکوکار ہو جاتا ہے تو جناب مسیحؑ کی تعلیم کو تو مذہب **محبّت** کی تعلیم کہا جاتا ہے۔ پھر میں اس **محبّت** کو عیسوی ممالک کے کس گوشہ میں تلاش کروں ؟ جب تک پہلی تین صدیوں میں عیسائی مذہب۔ فقرا۔ غربا۔ خدام اور غلاموں کی جماعت تک محدود رہا۔ عیسائیوں میں ایک حد تک شفقت محبّت اور رواداری کے آثار تھے۔ لیکن یہ تو ضرورت وقت یا مرتا کیا نہ کرتا کا مصداق کہا جا سکتا ہے شیخ سعدیؒ نے اس حقیقت کو کس خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

تواضع زگردن فرازاں نکوست
گدا گر تواضع کند خوئے اوستؔ

پہلے تین صدیوں کے عیسائی مسلمتاً گدا اور درویشوں کی حیثیت رکھتے تھے سوال تو یہ ہے کہ جب شاہ قسطنطین نے عیسائیت قبول کر کے آنے والی مسیحی نسلوں کو **گردن فراز** بنا دیا۔ تو پھر وہ محبّت وانکسار وشفقت کہاں گئی؟ میں اِن صفحات کو اس قتل وغارت کی داستان سے خون آلودہ نہیں کرنا چاہتا۔ جو عیسائیوں کی عیسائیوں کے ہاتھ سے ہوئی۔ ایک خون کا دریا تھا جو یورپ میں مذہب کے نام پر آج سے ایک صدی پہلے بہتا رہا۔ اور یہ قاتل ومقتول سب کے سب عیسائی ہی تھے۔ پھر ظلم وسفاکی کے آلات اور مشینیں جو اس مذہب **محبّت** کے معلموں کے دماغ نے تجویز کیں۔ اُن کا ذکر تو درکنار اُن کا تصوّر تک رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ اس تاریخی حقیقت کو ایک فقرہ میں ادا کر دیتا ہوں۔ کہ عیسائیت کے نام پر جس قدر ظلم۔ خونریزی۔ سفاکی۔ درندگی وغیرہ عیسائیوں نے عیسائیوں کے ساتھ برتی۔ اس کا عشر عشیر بھی مذہب چھوڑ دنیوی معاملات میں کسی قوم نے کسی قوم کے ساتھ مسلسل طور پر نہیں کیا۔

لہ۔ ترجمہ۔ امیر آدمی کے لئے عاجزی کرنا اچھّی بات ہے۔ گداگر اگر عاجزی کرے تو وہ اس کی عادت ہی ہے؛

تاتاری سفاکیاں آندھی کی طرح آئیں اور چلی گئیں۔ آج خود عیسائی اُن ایام کا نام **ایام تاریکی** رکھتے ہیں۔ آج بھی مذہب کے نام پر تو نہیں پولیٹیکل اور قومی جنگ یورپ میں ہوئے۔ کیا وہ اسی **مذہب محبّت** کے مختلف پرستاروں میں نہیں ہوئے۔ **تا دیگران چہ رسد**[1]۔

میں اس امر کو تسلیم کرتا ہوں کہ جناب مسیحؑ **مذہب محبّت** کو ہی دنیا میں لائے اور میرے نزدیک تو ہر مذہب حقہ کا موضوع یہی ہے۔ لیکن گذشتہ سولہ سو برس کا تجربہ اور عمل یہ قطعاً ثابت کرتا ہے۔ کہ جناب مسیحؑ کے وعظ وخطبات اپنے مقصد کے پورے کرنے میں یقیناً ناکام رہے۔ اُن کی باتیں تو دل لبھانے والی ہیں لیکن وہ عمل میں نہیں لائی جاسکتیں۔

کسی معلم کے تعلیم کردہ اصول خواہ کتنے ہی اعلیٰ کیوں نہ ہوں۔ اگر وہ معلم خود اُن اصول کو عملاً قائم کرنے کے طریق نہ تبلائے۔ اور آنے والی نسلوں پر ہی ان طریقوں کی دریافت چھوڑ جائے تو پھر ناکامی ہی ناکامی ہے عیسائیت یا کلیسیا مسلماً ناکام ثابت ہوئی۔ اس پر آج انہوں نے شہادت دی ہے۔ جو مغرب میں آسمان عیسائیت کے روشن ستارے ہیں۔ اس ساری ناکامی کا باعث اگر ایک سطر میں واضح طور پر بیان ہوسکتا ہے تو میں نے یہاں

---

[1] تو دوسروں تک کیا پہنچتا ہے۔

بیان کر دیا۔ بالمقابل اسلام اور اس کی اخوت کو دیکھو۔ اس کے عالمگیر ہونے میں کیا شبہ ہے۔ اور تو اور خود یورپ کے ارباب حل و عقد اس سے حیران ہیں۔ انہیں سمجھ نہیں آتی کہ اگر فرانسیسی عیسائی ایک جرمن عیسائی کے خون کا آٹھوں پہر پیاسا رہتا ہے۔ تو ایک ہندی مسلمان کے جذبات محبت پر ہزاروں کوس کا بُعد اور قومی غیرت کیوں اثر انداز نہیں۔ وہ کیوں ایک دوسرے کے جانذادہ ہیں؟ بات یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے نہ صرف کسی امر کی ضرورت ہی بیان کر دی یا اُس پر زور ہی دیا۔ بلکہ اس امر کی تحلیل و تفرید کی۔ اُسکے اصول قائم کئے۔ ان اصول کو وجود میں لانے کے اسباب بتلائے۔ پھر اُن اسباب سے متمسک ہونے کے طریق بتلائے۔ اِن طریقوں پہ چلنے کا نام راستبازی اور تقویٰ رکھا۔ پھر اس امر مطلوبہ کے خلاف جن جن باتوں کا امکان تک بھی تھا۔ ان کا سدِباب فرمایا۔ اور ہر ایک بات میں انسانی فطرت کے جذبات۔ اسکے تقاضے اُس کے میلان کو سامنے رکھا۔ خدا داد جذبات کو ہلاک کرنے کی تعلیم نہیں دی بلکہ ان جذبات کے لئے ایسے خوبصورت اور موزون سانچے تجویز فرمائے۔ کہ جن میں جذبات کی ردی سے ردی شکل اور ان کا سفلی سے سفلی جوہر بھی ڈھل کر اخلاق فاضلہ کی شکل اختیار کر لے۔ انسان کے جذبات اپنی ابتدائی اور بہیمی شکل میں مختلف دھاتوں کی اس شکل کی طرح ہوتے ہیں جنہیں ہم فلزات کہتے ہیں۔ یہ سونا۔ چاندی لوہا جو دھاتوں

کے بادشاہ ہیں۔ اپنی ابتدائی صورت میں کنکر اور پتھر ہی ہوتے ہیں۔ کسی سونے کی کان کو جا کر دیکھ لو۔ سونے کے کنکر بیسیوں مشینوں سے نکل کر طلاء خالص بن جاتے ہیں۔ جس طرح یہ کنکر اور پتھر زمین کی انتڑیوں میں ہوتے ہیں۔ اسی طرح بہیمی جذبات کا مولد انسان کا معدہ اور اس کی آنتیں ہیں اب اگر انجیل کی دی ہوئی مسیحی تعلیم میں جسمانیات کی طرح امور ذہنیات و اخلاقیات کے لئے ان مشینوں اور آلات کا ذکر موجود ہے تو جناب مسیحؑ مذہب محبّت کی تکمیل کر گئے۔ اور اگر نہیں اور یقیناً نہیں جیسا کہ خود آج مسیحی فضلائے نے تسلیم کر لیا ہے۔ جس پر اُن کا عمل شاہد ہے کہ کیونکہ وہ اب ان مشینوں کی ساخت کی فکر میں لگے ہیں تو پھر انسان کے بنانے سے تو مذہب نہیں بنتا۔

مذہب محبّت کے اصول تو وہی مدون کر سکتا ہے۔ جو فطرتِ انسانی سے کماحقہٗ واقف ہو۔ علم النفس والقوٰے کی باریکیوں سے واقف ہو۔ وہ لوگ اس حقیقت کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔ جو روح کو اخلاق اور اخلاق کو جذبات بہیمیہ سے اس قدر الگ سمجھتے ہیں کہ گویا ایک کو دوسرے سے کچھ تعلق ہی نہیں۔ پھر جسم کو ادراک سے بالکل جداگانہ سمجھتے ہیں حتیٰ کہ بعض کے نزدیک **جوہر حیات** بھی جسم سے ایک الگ تھلگ چیز ہے وہ خیال کرتے ہیں۔ کہ یہ جوہر کسی اور ستارے سے اُتر کر جسم میں آملتا ہے یا لمقابل

مذہب حقہ یہی ہے کہ جس طرح جوہر اصلی ذرات ایثری سے چل کر مختلف شکلیں اور ہیولے اختیار کرتا ہوا اپنے قوائے مضمرہ کو ظاہر کرتا آتا ہے۔ وہی جوہر اصلی عالم حیوانات میں انسانی جسم اختیار کر کے منزل اوّل پر بہیمی جذبات کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہی بہیمی جذبات تعدیل و تادیب میں آکر اوّلاً اخلاق عامہ پھر اخلاق فاضلہ اور اس کے بعد روحانیات ہو جاتے ہیں۔ جس طرح کہ ایک تخم۔ کونپل۔ تنہ۔ شاخیں پتے۔ پھول۔ پھل بن کر سب حالتوں کو بھی قائم رکھتا ہے۔ اور اس کی ہر منزل کی صورت ایک دوسرے کی ممد و معاون ہوتی ہے اور پھل کی پختگی اور اُس کی خوبی کا حصران سب چیزوں کے قیام اور ترو تازگی پر ہوتا ہے۔ اسی طرح روح کا ایک کامل جوہر اُسی وقت آکھلتا ہے جب جسم جذبات۔ اخلاق عامہ و فاضلہ سب کے سب قائم رہیں۔ اور سب کی حد و مناسبت میں آبیاری ہو۔ جس طرح کونپل سے لے کر پھل تک مختلف شکلیں ایک ہی بیج کی ہوتی ہیں۔ اسی طرح یہ کل کے کل امور متذکرہ نفس انسانی کی ہی صورتیں ہیں جو دراصل جسم میں سے نکلتا ہے۔ نفس ہی حقیقی اصلاح پا کر مختلف ہیولے بدلتا ہوا روح ہو جاتا ہے۔ قرآن شریف کی آیت والنفس وماسوّٰھا (نفس جب تعدیل و تہذیب پا جائے) اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔

مجھے یہاں ان دو نظریوں میں سے کسی ایک کی صحت پر بحث منظور نہیں۔

یہ میرے مضمون سے کسی قدر دُور ہے۔ اگرچہ موجودہ مغربی فضلا کا خیال ان گذشتہ پچاس سالوں میں قرآن کریم کے نظریہ کی طرف آرہا ہے۔ یہ لوگ اب **جوہر حیات** ادراک۔ روح کو کسی اور دنیا سے آیا ہوا نہیں سمجھتے۔ بلکہ جسم کو ہی اُن کی ماں اور مولد قرار دیتے ہیں۔ مجھے یہاں صرف اسی قدر دکھانا ہے۔ کہ ان دو نظریوں کے ماتحت کسی اخلاق کے سدھارنے یا پیدا کرنے کے راستے کس قدر ایک دوسرے کے متضاد اور مخالف ہو جائیں گے جو شخص معانی بالا میں روح اور جسم کو یا جذبات بہیمہ کو اخلاق فاضلہ سے قطعًا الگ سمجھتا ہے۔ وہ ایک چیز کی پرورش یا حیات دوسرے کی موت و ہلاکت میں دیکھتا ہے وہ راہبانہ نفس کشیاں جو ہندو۔ بدھ اور عیسائی مذہب کی ابتدائی صدیوں میں پائی جاتی تھیں۔ اور ہر طرح بیسود ثابت ہوئیں۔ وہ اسی نظریہ کا نتیجہ تھیں۔ ان کے نزدیک جذبات بہیمیہ یا جسم کو مارنا ہی روح کے لیے ضروری ہے۔ اسلام نے اِن سے الگ راہ اختیار کی۔ اسلام کسی جذبہ کی ہلاکت کی سفارش نہیں کرتا اور نہ جسم کو مارتا ہے۔ اسلام کل کے کل جذبات کو مقام اعتدال پہلے آتا ہے جس چیز کا نام محبت خدا اور محبت خلق اللہ ہے۔ جو ہر قسم کی نفسانی ملونیاں سے پاک ہو کر اُس مقام اعلیٰ پر پہنچ جاتی ہے۔ جس کا امتیازی نشان ایثار کا کمال اور بے نفسی کا معراج ہے۔ وہ اپنی ابتدائی شکل میں وہی جذبہ رویہ ہے۔ جس کا نام شہوت حیوانی ہے۔ بالمقابل وہ درندوں کا جذبہ

جسے غیظ و غضب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہی حکمت و عقل کی حکومت کے ماتحت شجاعت۔ سیاحت صحیحہ۔ غیرت وغیرہ بن جاتا ہے۔ جس چیز کا نام دیوثی۔ بے غیرتی۔ ریا۔ طمع۔ رعایت۔ ناجائز۔ جنبہ داری ہے۔ وہ محبّت ہی کی بدنما شکلیں ہیں۔ بے رحمی۔ سفاکی غصّہ ہی کی قبیح صورت کا نام ہے۔ پھر محبت اور غضب۔ غیر معتدل طریق پر مل کر اگر انسان میں تعصب۔ حسد۔ نکتہ چینی۔ استہزا پیدا کر دیتے ہیں۔ تو یہی غضب و محبّت صحیح طریق پر امتزاج پا کر ہم میں استقامت۔ حمایت جائز۔ عدل۔ نصفت شعاری کا موجب ہو جاتے ہیں۔ مَیں نے تمثیلاً یہ چند باتیں لکھ دی ہیں۔ والّا انسان کے کل کے کل اخلاق اور اس کی کل کی کل کج خلقیاں انہی دو جذبات محبّت و غضب کی دو شاخیں ہیں۔ وہ مذہب حقیقتِ محبّت کیا سمجھ سکتا ہے۔ جو غضب کو ایک مکروہ چیز سمجھ کر اس عطیہ ربّی کی فکر ہلاکت میں لگ جاتا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ غصہ اپنے صحیح استعمال میں دراصل درشت شکل میں محبت ہی ہے۔ قوم اور ملک کی محبّت کا تقاضا یہ ہے۔ کہ ہم اُن کی حفاظت کے لئے اُن لوگوں کو سزا دیں جو ملکی قومی حفاظت کے مخل ہوں۔ عدالت کا کمرہ اگر مفاد قومی کی محبّت و حفاظت نے بنایا ہے۔ تو اغراض عدالت کا تفاذ غصہ کی اُس شکل میں ہوتا ہے جسے اصطلاحاً جرمانہ۔ تازیانہ۔ جیل۔ پھانسی کہتے ہیں۔ ظالموں کے خلاف جنگ، محبّت اور غضب کے صحیح استعمال کا نام ہے۔

آج سائنس کے انکشافات نے کل پُرانی تھیوریوں کو بدل دیا ہے۔ اور تو اور خود وہ دہر پرست بھی جو آسمان سائنس کے روشن ستارے ہیں۔ اپنی تمام سابقہ تھیوریوں کو چھوڑ کر اس بات کے ماننے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ کہ کل کائنات پر ایک ہی **حکومت** ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ ابتداء سے انتہا تک لاتبدیل قوانین کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ گو ہزاروں ہی قانون دریافت ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن وہ سب کے سب قوانین ایک دوسرے کی معاونت میں ایک ہی سرچشمہ سے نکلے ہوئے نظر آتے ہیں خود حکیم **ہیکل** نے کائنات کی پہلی سے پہلی شکل کا نام نہ **مادہ** ۔ نہ **ایٹم** ۔ نہ **عنصر** ۔ نہ **برقی ذرات** ۔ نہ **اثیری** ریزے لکھا ہے۔ بلکہ یہ سب کے سب جس سے نکلے ہیں اُس نے اس کا نام **لاسیبس ٹنس** تجویز کیا ہے۔ یعنی وہ کوئی چیز ہے۔ جو ہمہ قانون ہے کاش وہ اس کا نام **لاسپرٹ** (روح قانون) رکھ دیتا۔ تو ہمارا اس کا جھگڑا نہ رہتا۔ قانون اگر مقنن کو چاہتا ہے۔ تو ہم ایک اعلیٰ ہستی کے قائل ہیں۔ جس سے یہ سب قانون نکلے ہیں۔ وہی اسلامی خدا ہے۔ اب توضدیت کے جھگڑے ہیں والا معاملہ تو صاف ہے۔ صرف لفظی تنازع باقی رہ گیا ہے چنانچہ جو مذہب ان حکماء دہر پرست کے نزدیک کائنات پر حکمران ہے اس کا نام وہ **مونازم** رکھتے ہیں۔ جس کے لفظی معنی **مذہب توحید** ہے اب یہ اسلام نہیں تو اور کیا ہے؟ یعنی کائنات کا ایک ہی سرچشمہ سے نکلے

ہوئے قوانین پر چل کر اپنے حدِ کمال پر پہنچنا۔

جس بات نے اِن حکماء کو **مون ازم** (مذہب توحید) کا قائل کرایا ہے وہ یہ بات ہے۔ کہ ایک ہی قسم کے قوانین جسمانیات سے لے کر روحانیات تک کائنات کی ہر منزل ارتقاء پر حاوی ہیں یعنی جسمانی۔ جذباتی۔ ذہنی۔ اخلاقی روحانی قوانین دراصل ایک ہی ہیں۔ چنانچہ مسئلہ زیر بحث میں جذبات بہیمیہ اسی قسم کے قوانین کے ماتحت ارتقائے منازل طے کرتے ہوئے روحانیت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ جس طرح اشیائے خوردنی و نوشیدنی آخر کار خون صالح بن کر روح حیات کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ جو شکل نقطہ سیاہ دل میں ہے۔ جس کو زبان عربی میں حَب کہتے ہیں۔ بہیمی جذبات کی آخری اعلیٰ وارفع شکل بھی وہ پاک محبت ہے۔ جو روحانیت کی روح ہے۔ عربی زبان میں لفظ محبت کا مادہ لفظِ حُب ہے۔ جس طرح لفظ **خَلق** جس کا جسمانیات سے تعلق ہے۔ اوراکات میں **خُلق** ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حَب بھی حُب ہو جاتا ہے۔ جس طرح معدہ اور آنتیں خون صالح اور حب القلوب (سویدائے دل) کی پہلی جائے ولادت ہے۔ اسی طرح مسلم صوفیوں کے نزدیک بہیمی جذبات کا مقام بھی معدہ اور آنتیں ہی ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کو آج حکماءِ مغرب نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ جس طرح معدہ کی تیار کردہ چیزیں کیلوس اور کیموس بن کر جگر کی حکومت کے ماتحت تمام نقائص سے پاک ہو کر خون بن جاتی

ہیں۔ اُسی طرح قوت غضبی جس کا مقام جگر ہے جذبات بہیمیہ میں سے بہیمیت کو دور کر کے انہیں اخلاق بنا دیتی ہے۔ کیا عجیب بات ہے کہ لفظ کبد جس کا اگر ایک معنی جگر ہے۔ تو دوسرا معنی غصہ و غضب ہے لیکن خون صالح بننے کا سارا نظام اس روح حیات یعنی آکسیجن پر منحصر ہے جو تنفس اور اُس کے بعد پھیپھڑوں کے ذریعہ ہر ایک کارکن عضو کو زندگی بخشتی رہتی ہے۔ اس آکسیجن کا نام اسلامی حکماء کی اصطلاح میں روح ہے۔ بالمقابل روح عربی زبان میں الہام کو بھی کہتے ہیں۔ یعنی الہام خداوند۔ جذبات ردیہ کو آخری صورت صالح میں لانے کے لیئے وہی فعل کرتا ہے۔ جو آکسیجن (روح) خون صالح اور پھر اس سے سویدائے قلب بنانے میں کرتی ہے۔ الغرض نظام ایک ہی ہے۔ دل ہی جسمًا اور روحًا مرکز روح حیات ہے۔ قربان جاؤں خاتم النبیین علیہ الف الف سلام پر جس نے اس حقیقت کو دو لفظوں میں کھول دیا۔ حضورؐ فرماتے ہیں۔

"تمہارے پہلو میں گوشت کا ٹکڑا ہے جس کو دل کہتے ہیں جس کے فاسد ہونے سے سب چیزیں فاسد ہو جاتی ہیں"

اس مختصر سی بحث سے میری مراد یہ ہے۔ کہ قوت غضبی یا غصہ۔ اصلاح خُلق کے لیئے ویسا ہی ضروری ہے۔ جیسے جگر اصلاح خَلق (جسم) کے لیئے اس میں شک نہیں۔ کہ قوت غضبی کی بد استعمالی تمام اخلاق کو تباہ کر دیتی ہے یہی حال نظام جسم کا ہے۔ جگر کی خرابی بھی جسم کو بگاڑ دیتی ہے۔ لہذا مذہب

محبت کے قوانین صحیح طور پر مرتب نہیں ہو سکتے۔ جب تک جذبہ غضب کی تعدیل و تہذیب کے قوانین مرتب نہ کئے جائیں۔ وہ مذاہب جو اس جذبہ کی بیخ کنی کرتے ہیں۔ وہ مذہب محبت کے خادم نہیں ہو سکتے۔ اس معاملہ میں جہاں تک جناب مسیحؑ اور جناب بُدھ کی تعلیمات ہم تک پہنچتی ہیں، وہ مذہب محبت کی تدوین میں ہمیں پوری مدد نہیں دیتی ہیں۔ وہ تعلیمیں اس ضروری جذبہ کی ہلاکت کے درپے ہیں۔ اگر نظام ملک کے لئے کسی کوتوال یا مجسٹریٹ کی ازحد ضرورت ہے۔ تو نظام اخلاق کے لئے قوت غضبی ہی ضروری چیز ہے۔ ممکن ہے کہ مسیحؑ اور جناب بدھ کی تعلیمات ہم تک اصلی شکل میں نہ پہنچی ہوں۔ یا وہ وقتی ضرورت کا علاج ہوں۔ اگر اُن میں قوت غضبی کو نفرت ہی سے دیکھا گیا ہے۔ اور اس کے عدم استعمال ہی پر زور دیا گیا ہے۔ تو وہ **مذہب محبت** کے قیام کی حارج ہیں ؛

انسان کے طبعی جذبات کی تسکین اُس کو آٹھوں پہر مختلف اشیاء کے حصول میں لگائے رکھتی ہے۔ جن کے حصول سے اس کو راحت اور عدم حصول سے اُس کو رنج ہوتا ہے۔ جن چیزوں سے اس کو راحت ہو وہ اس کی محبوب ہیں۔ اور جو چیزیں اس کے اسباب راحت کی مانع ہوں۔ اُن سے اُس کو نفرت ہوتی ہے۔ یعنی اوّل الذکر اس کے جذبہ محبت اور آخر الذکر اس کے جذبہ غضب کو بھڑکاتی ہے۔ اگر تو اسباب راحت کے حصول کا اُس کو

کوئی حق حاصل نہیں۔ تو پھر جس طرح اس کی محبت ناجائز ہے۔ اسی طرح جائز اسباب آسائش کے حصول میں موانعات پر اس کو غصہ آجائے۔ تو وہ فعل صحیح ہے۔ الغرض مذہب حقہ کا فرض یہ ہے کہ محبت اور غضب کے صحیح استعمال بتائے اور انہیں مقام اعتدال پر لے آئے۔

یہ صفحات اجازت نہیں دیتے کہ میں اس موضوع پر قرآن کریم کی کل ہدایات کو بالتفصیل جمع کردوں۔ میں قوت غضبی کے متعلق چند موٹے موٹے قوانین لکھ کر ان چند طبعی طریقوں کا ذکر کروں گا۔ جن کے ماتحت **جذبہ شہوت** آخر کار محبت قدسیہ بن جاتا ہے:۔

قوت غضبی خلاف طبع یا نقصان دہ امور سے تحریک میں آتی ہے اس جذبہ کے محرک تین قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں۔ **ایک** وہ جو ہم سے کمزور یا ہمارے ماتحت ہوں۔ **دوسرے** وہ جو ہم پر غالب ہوں۔ **تیسرے** وہ جو ملکی یا قانونی یا کسی اور حقیقت سے ہمارے ہمسر ہوں ۔ ان تین گروہوں میں گروہ اوّل کا مقام بہت نازک ہے۔ کیونکہ اس کی حیثیت ہی ادنےٰ سے ادنےٰ بات پر ہمیں بھڑکا دیتی ہے۔ (نزلہ بر عضو ضعیف می ریزد) اسی مقام پر انسان غصہ میں دیوانہ ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اُس کے متعلق ذیل کی ہدائیت فرمائی ہے

"والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس واللہ یحب المحسنین"۔ (آل عمران : ۱۳۴)

(مومن) اپنے غضب کو دباتے ہیں۔ (پھر جن لوگوں نے غصہ بھڑکایا تھا، اُن لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں (پھر اُن سے احسان بھی کرتے ہیں) اللہ تعالےٰ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

اِن مقدس ہدایات کی بہترین تشریح جناب امام حسنؓ کے ایک واقعہ سے ہو جاتی ہے۔ آپ کا ایک خادم گرم شوربے کا پیالہ آپؓ کے لیئے لایا۔ اتفاقاً اس کے پاؤں نے لغزش کھائی اور شوربے کا پیالہ گر پڑا۔ جس سے لباس چھوڑ امام معصومؓ کا جسم بھی جلا۔ غصہ کا بھڑکنا طبعی امر تھا۔ لیکن چہرۂ مبارک پر ابھی آثار غضب پیدا ہی ہوئے تھے۔ کہ خادم نے "الکاظمین الغیظ" پڑھا امام ہمامؓ نے کامل ضبط سے کام لے کر فرمایا کہ میں نے غصہ چھوڑ دیا۔ جس پر خادم نے آیت شریف کا دوسرا ٹکڑا "والعافین عن الناس" پڑھا۔ آپ نے فرمایا۔ میں نے معاف کر دیا۔ خادم نے "واللہ یحب المحسنین" کہہ کر آیت شریف کو تمام کر دیا۔ حضرت امام کے اخلاق تو قرآن مجید کے اخلاق تھے۔ آپؓ نے یہ سن کر نہ صرف اپنی خدمت سے ہی اس کو آزاد کر دیا۔ بلکہ زر خطیر دے کر اس کو ہمیشہ کے لیئے کسی اَور کی دست نگری سے بھی غنی فرما دیا۔

کہتے ہیں غصہ شیطان ہوتا ہے یہ بھی لکھا ہے کہ شیطان بطور ہمزاد انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ یہ شیطان تعدیل و تادیب سے مسلمان ہو جاتا ہے۔ اب اگر کسی نے غصہ کے وقت اپنے شیطان کو مسلمان بناتا ہو۔

تو اس آیت شریف پر عمل کرے۔ کہاں غیض وغضب اور کہاں اس کے مورد کے ساتھ مروّت واحسان۔ احسان محبت کا ایک اعلیٰ مرتبہ ہے۔ جس کے ماتحت ایک شخص غیر حقدار سے مروّت کرکے حقیقی محبّت کا اعلیٰ ثبوت دیتا ہے:

تحریک غضب کا دوسرا مقام کسی ایسے شخص کا مکروہ فعل ہوتا ہے۔ جو ہم سے طاقتور ہو۔ جس کے مقابل انتقام لینا تو درکنار اظہار غصّہ بھی ہم نہیں کر سکتے۔ اس کے متعلق جناب مسیحؑ کی تو یہ تعلیم ہے کہ "شریر کا مقابلہ نہ کرنا۔ بلکہ جو کوئی تیری دہنی گال پر طمانچہ مارے۔ دوسرا بھی اُس کی طرف پھیر دے۔ اور اگر کوئی تجھ پر نالش کرکے تیرا کرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی اُسے لے لینے دے۔ اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے۔ اُس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔" دمتی کی انجیل باب ۵ آیت ۴۰ تا ۴۲)

جناب مسیحؑ کی یہ تعلیم وقت کے مناسب حال تھی۔ آپ کی قوم محکوم و ذلیل تھی۔ فریق غالب کے مقابل مغلوب کا اظہار غضب کرنا گویا اپنی موت کو آپ بُلاتا ہے۔ ان حالات میں تو یہ مسیحی وعظ ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سے آخر کار ایک دن سچی غیرت اور شجاعت بھی مر جاتی ہے۔ یہ ایک وقتی علاج تو ضرور ہے۔ لیکن اس سے بعض اخلاق فاضلہ کا خون ہو جاتا ہے۔ اور اگر ان مواعظ کو زندگی کا دستور العمل ہی بنا لیا جائے۔ تو دنیا سے امن اُٹھ جاتا ہے شرارت کی رسی دراز ہو جاتی ہے۔ خود گذشتہ سو صدیوں میں عیسائی اس پر عمل نہیں کر سکے

لیکن غالب کے فعل ناجائز کے مقابل مغلوب کیا کرے۔ کہ وہ اُس کے شر سے بھی بچ جائے اور اپنے اندر ودیعت شدہ قوائے غیرت وشجاعت کو بھی قائم رکھ سکے؟ ان حالات کے ماتحت بروئے نص قرآنی آنحضرت صلعم نے مسئلہ ہجرت کی تعلیم فرمائی۔ ان مجبوریوں میں انسان کا فرض ہے کہ مقام شرارت کو چھوڑ دے۔ فرعون کے مقابل جناب موسیٰ کا فعل۔ صحابہؓ کا حبشہ کی طرف چلا جانا۔ پھر خود حضورؐ کی ہجرت اسی قبیل سے ہے۔

تیسرا امر روزانہ زندگی کے متعلق ہے جس میں فعل بد کا ارتکاب کسی ایسے شخص سے ہوتا ہے جسے قانون وغیرہ نے ہمارا ہمسر کر دیا ہے کسی سلطنت کے ماتحت رعایا کا ایک دوسرے کے خلاف بدی کرنا۔ یا ایک قوم کا دوسری قوم کے خلاف کوئی ناجائز فعل کرنا جو موجب جنگ وفساد ہو۔ یہ ایسی باتیں ہیں۔ جن کا علاج مسیحؑ اور بُدھ کی تعلیم تو نہیں کر سکتی۔ قرآن کریم نے اُس کے لئے یہ ہدایت فرمائی "جزاء سیئة سیئة بمثلها فمن عفی واصلح فان الله غفور الرحیم"۔ بدی کا بدلہ تو بدی ہے (ہاں) جو معاف کر دے (اور اُس سے) اصلاح ہوتی ہو تو اللہ تعالےٰ غفور الرحیم ہے مقصد اصلی تو اصلاح ہے۔ اگر شریر کی اصلاح معاف کرنے سے ہو تو معاف کر دیا جائے۔ لیکن اگر معاف کرنے سے شریر شرارت میں بڑھتا ہے یا اس کا فعل دوسروں کو شریر بناتا ہے۔ اور اس سے امن عامہ میں خلل

پیدا ہوتا ہے۔ تو پھر بدکار کو سزا دینا ہی لازم ہے۔ جناب موسیٰؑ نے دانت کے بدلے دانت فرمایا۔ جناب مسیحؑ نے عفو پر زور دیا۔ یہ دو تو تعلیمیں اپنے اپنے مقام پر صحیح تھیں۔ لیکن مہیمن و حمید کتاب نے اپنے سامنے اصلاح کو رکھا جس کے حصول کے لئے اگر ضرورت ہو تو دانت کے بدلے دانت توڑا جائے اور اگر عفو سے نتیجہ مرتب ہوتا ہو تو عفو کیا جائے۔ ان دو حکیمانہ تجاویز کو بیان فرما کر پھر بھی رحم اور معافی کی طرف انسان کو متوجہ کرنے کے لئے آیت کا خاتمہ ان اللہ غفور الرحیم پر کیا۔ خلاصہ اس ساری بحث کا یہ ہے کہ قوت غضبی عطیہ رحمان ہے۔ اگر یہ بُری ہی چیز تھی۔ تو خالق فطرت نے ہمیں کیوں دی۔ ہاں اس کا صحیح استعمال بہت ہی نازک ہے جس کے لئے بہتر سے بہتر ہدایات قرآن مجید نے فرمائیں۔ ساری کتاب ان مندرجہ بالا اصول محکمات کی تشریح میں ہے۔ جن کی تفصیل کی سردست یہاں گنجائش نہیں ؛

غضب کی طرح محبّت کی بھی بد استعمالیاں ہیں۔ بے محل پیار غضب سے بدتر نتائج پیدا کرتا ہے۔ ایک بچّہ کو پیار میں آکر بدعنوانیوں سے نہ روکنا محبّت نہیں کہلائی جا سکتی۔ بلکہ اس کی اصلاح کیلئے اسکے ساتھ ناملائمت سے پیش آنا ہی اُس سے محبّت کرنا ہے گو اس سے قوت غضبی تحریک میں آجاتی ہے۔ پاک محبّت اپنے حقیقی معنوں میں اپنے اظہار کے لئے اُس ایثار بے نفسی کو چاہتی ہے۔ جو ایک انسان دوسرے کے حقیقی فائدہ کے لئے

اپنی مکسوبہ چیزوں یا خداداد طاقتوں کو صرف کرتے ہوئے ظاہر کرے اگر یہ باتیں موجود نہ ہوں۔ تو کسی کا کوئی ایسا فعل جو پیار کے رنگ میں کیا جائے۔ محبت نہ کہلائے گا۔ انسان کی فطرت میں یہ جوہر محبت تو ودلیعت شدہ ہے۔ لیکن یہ مذہب حقہ کا کام ہے کہ اس جوہر کو کسی طبعی طریق میں نشوونما دے کر اُسے اُس مقام تک پہنچادے۔ کہ انسان دوسروں کے مفاد کے لئے جئے۔ اُس کے کل کے کل مکسوبات و مقبوضات اور اس کی تمام کی تمام خداداد طاقتیں خلق اللہ کے نفع میں الگ جائیں۔ مذہب الٰہیہ کے سب کے سب اوامر و نواہی کچھ اس قسم کے ہونے چاہئیں کہ جن پر چل کر انسان مخلوق خدا کے لئے شفقت و رحمت ہو جائے۔ اس لئے اسلام کی تعریف آنحضرت صلعم نے تعظیم لامر اللہ وشفقۃ علی خلق اللہ ہی فرمائی ہے۔ اس امر پر میں پہلے بحث کر آیا ہوں ؛

اسلام نے اس شجر محبت کا ذخیرہ متاہل زندگی کو قرار دیا ہے۔ جہاں محبت کا پہلا تخم جس کی شکل شہوت حیوانیہ ہے طبعی رنگ میں اشیاء کی خو بو لئے ہوئے بے تکلف نشوونما پانے لگتا ہے زن و مرد دراصل منزل اوّل میں جذبات حیوانیہ کے ماتحت جمع ہوتے ہیں۔ زوجیت کے پہلے محرک وہ غیر مرئی ننھے ننھے حیوانات ہیں۔ جنہیں طبی اصطلاح میں سپرما اور اووا کہتے ہیں۔ مرد و عورت

ترجمہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعظیم کرنا اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر شفقت کرنا۔

کی رغبت متقابلہ کے محرک یہی دو قسم کے کیڑے ہوتے ہیں۔ اگر ایک لمبی متاہل زندگی میاں بیوی میں ایسے وقت پاک محبت پیدا کر دیتی ہے جب ایام کہولت انہیں تعلقات زنا شوئی سے فارغ کر دیتے ہیں تو وہ انہی غیر مرئی حیوانات کے کرشموں کا بقیہ ہے۔ اب اگر یہ پاک محبت از قبیل روحانیات ہے تو وہ لوگ غور کریں جو روحانیات کو جسمانیات سے الگ سمجھتے ہیں :

کتخدائی سے پہلے ایک نوعمر کا نصب العین اس کی اپنی ذات کا مفاد ہی ہوتا ہے وہ اپنے ہی لئے جیتا ہے۔ اپنے ہی واسطے کماتا ہے۔ وہ خود غرضی کا بہت حد تک مجسمہ ہوتا ہے۔ شادی ہونے پر کچھ تھوڑا ہی عرصہ گذرتا ہے کہ تسکین جذبات شہوانی ہی اُس میں ایثار کا رنگ پیدا کرنا شروع کر دیتی ہے۔ اور اب وہ اپنی گاڑھے پسینے کی کمائی کا مالک کسی اور کو بھی سمجھنے لگتا ہے۔ کچھ مدت کے بعد جب اُس کے بال بچے ہو جاتے ہیں تو اس کی تمام زندگی انہی کے لئے وقف ہو جاتی ہے۔ وہ صبح سے شام تک اپنے آپ کو مارتا ہے اور بطیب خاطر اپنی کمائی سے اپنے لئے فقط روٹی کپڑا نکال کر باقی سب کا سب دوسروں کا مال سمجھتا ہے۔ اب اگر ایثار کے یہی معنی ہیں۔ کہ انسان کے مکسوبات اور اُس کے قوائے اپنے سے علاوہ کسی اور کی خدمت میں لگ جائیں اور یہ سب کچھ کسی تکلیف سے نہیں بلکہ طبعاً و اضطراراً ہو تو یہ رنگ کم و بیش متاہل زندگی

ہی میں نظر آتا ہے۔

محبّت کے علاوہ قوّت غضبی کے صحیح استعمال کی مشق بھی کینے میں ہی ہوتی ہے۔ مَیں اُوپر بیان کر آیا ہوں۔ کہ قوت غضبی اصلاح کے لئے ہی پیدا ہوئی ہے یعنی جہاں ملائم طریقے اصلاح نہ کر سکیں وہاں درشت روئی عموماً مفید ثابت ہوتی ہے۔ لیکن موقع اصلاح کے سوا غصہ کا اور مواقع پر رُک جاتا ایک نہایت ہی مشکل امر ہے۔ بہرحال یہ کٹھن سے کٹھن منزل بھی اہل وعیال میں نہایت آسانی سے طے ہوجاتی ہے۔ وہی باتیں جو کسی اور حالت میں یا اگر کسی اور سے سرزد ہوں۔ تو غصہ وغضب کی محرک ہوجاتی ہیں۔ وہی امر جب گھر میں اپنے بچّے یا بیوی سے سرزد ہو۔ تو غصہ درکنار لبوں پر ہنسی اور مسکراہٹ آجاتی ہے بہت سی باتیں اُن کی درگذر کی جاتی ہیں۔ غصہ بھڑکتا ہے اور ٹھنڈا ہوجاتا ہے۔ خون پی کر انسان رہ جاتا ہے اور اگر غصہ کا کسی درشت طریق پر اظہار بھی ہونے لگتا ہے۔ تو اُسی وقت جب بچے کی اصلاح اسی ایک طریق پہ آرہتی ہے۔ اور وہاں بھی اگر زدوکوب کی ضرورت پڑے۔ تو انسان کے ہاتھ بے تحاشا نہیں چلتے۔ مارتے وقت بھی یہی خیال ہوتا ہے کہ بچّے کو کہیں صدمہ نہ پہنچے۔ بی بی کے معاملات میں انسان اور بھی نرم ہوجاتا ہے۔ الغرض غصہ وغضب اگر رحمت بن سکتا ہے تو اس کا آسان محل متاہل زندگی ہے۔ اسی طرح پاک محبّت اگر اصلی معنوں میں ہر وقت ظاہر ہوتی ہے۔ تو اس کے محرک بھی بی بی بچے ہی ہوتے ہیں۔ بے شک غور کر کے دیکھ لو۔

طبعاً اور اضطراراً جذبہ شہوت و جذبہ غضب کی حقیقی اصلاح یا تعدیل و تہذیب اگر کہیں ہو سکتی ہے۔ تو عیال داری میں ہی ہوتی ہے۔ یہاں تو وہ ضعیفہ کنواریاں نظر نہیں آئیں۔ جو یورپ میں ہر جگہ پھرتی نظر آتی ہیں۔ اِن حقائق بالا کی تصدیق اگر کسی نے کرنی ہو تو ان کو مغرب میں جا دیکھے۔ بات بات پر بگڑتا۔ چڑچڑاپن زود رنجی اُن کی ایک ادنیٰ شان ہے۔ نہ وہ جوہر محبّت اہل و عیال نے اُن کے دل میں چمکایا۔ نہ غصے کی اصلاح کرنے کو اُن کے ہاتھ کوئی بچہ آیا۔ اسی امر کو مدِّنظر رکھ کر آنحضرت صلعم نے فرمایا۔ النکاح من سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔ نکاح کرنا میری ایک سنت ہے اور جو اس سے نفرت کرے وہ مجھ سے نہیں۔ قرآن کریم نے کتخدائی کی علّت بھی یہی بتلائی۔ وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً ؕ[1] (سورہ روم آیت ۲۱)

یعنی اس آیت میں خدا تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کہ ہم نے جو عورت و مرد کا جوڑا بنایا ہے۔ اس سے کوئی شہوت رانی مراد نہیں۔ تزناشوئی کے تعلقات جذبات کو ٹھکانے بٹھا کر مودت اور رحمت کی بیج کو جو فطرت انسانی میں ودیعت شدہ

---

[1] (ترجمہ) ”اور اس کے نشانوں میں سے ہے کہ تمہارے لئے تمہارے نفسوں سے بیبیاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے تسکین پاؤ اور تمہارے درمیان محبت اور رحم قائم کیا

ہے نشو و نما کی طرف لے آتے ہیں۔غور کا مقام ہے کہ قرآن مجید نے کس اعلیٰ حقیقت کو ان مقدس الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔شادی کی غرض کو کس طرح بلند اور ارفع کر دیا ہے۔ اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے ۔میں پھر کہتا ہوں کہ وہی قوت غضب اور وہی جذبہ شہوت جس کا نام بہیمیت اور سبعیت ہے اس ایک فعل زوجیت سے رحمت و محبت ہو جاتی ہیں۔کوئی ہے جو ان باتوں سے انکار کرے۔ وہ مذاہب **مذاہب محبت** کی حقیقت کو کیا سمجھیں جن کے بانیوں نے نہ شادی کی نہ متاہل زندگی کی عزت کی۔ آج فضلائے مسیحیت نے کلیسی مذہب کی تمام تعلیمات کو خیرباد کہہ کر مذہب مسیحیت کا نام مذہب محبت رکھا۔اور اب وہ اس فکر میں ہیں کہ وہ اس مذہب کے قواعد مرتب کریں۔ وہ بدھ مذہب کو بھی مذہب محبت ہی سمجھتے ہیں شاید ان کے نزدیک بعض ایسے اخلاقی احکام کا نام محبت ہے جن میں نرم دلی تو کمال درجہ کی ہو خواہ وہ عملی رنگ اختیار نہ کر سکے۔ ان دونو مذاہب میں زن و مرد کے تعلقات کے متعلق کم و بیش تعلیمات تو ہیں۔لیکن اُن کے بانیوں کی عملی زندگی ہمارے لئے راہِ ہدایت نہیں ہو سکتی۔ دوسری طرف اسلام نے متاہل زندگی کو ایک لطیف اور با راحت زندگی بنانے کے لئے اس قدر قوانین دئے ہیں۔ کہ ان کی نظیر کہیں نظر نہیں آتی۔ قوت غضبی کے متعلق میں اُوپر لکھ آیا ہوں کہ اُس کے اظہار کا آسان موقع وہ ہوتا ہے۔

کہ جہاں مورد غضب اپنے سے کمزور یا اپنے قبضے میں ہو۔ بیوی بچوں سے بڑھ کر اور کون نہایت آسانی کے ساتھ مورد غضب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یورپ میں اس کی کثرت سے مثالیں موجود ہیں۔ اس کثرت کی روک تھام کے لیئے آنحضرت صلعم نے فرمایا۔ خیرکم خیرکم لاھلہ یعنی تم میں سے بہترین انسان وہی ہے۔ جو اپنے بال بچوں کے ساتھ نیکی کا سلوک کرے۔ گھر کے باہر تو ہماری وضعداری یا دوسروں کا خوف یا سوسائٹی کا پاس ہم سے اضطراراً اور مجبوراً اچھے اخلاق ظاہر کرا دیتا ہے لیکن گھر کا میدان تو وسیع اور کھلا میدان ہے۔ وہاں تو ہم جو چاہیں کر گزریں۔ لیکن جب اس میدان میں ہی اضطراراً مذکورہ بالا حکم نبیؐ کے ماتحت ہم مودت اور رحمت کا ہی اظہار کرتے ہیں۔ تو لازماً بیرونی دنیا میں بھی ہمارے اخلاق سلجھ جاتے ہیں کتخدائی کے تعلقات کا دائرہ اہل وعیال کے بعد اپنے احاطے میں اور رشتے داروں کو بھی لے آتے ہیں۔ کچھ بی بی کے رشتے دار کچھ اپنے رشتہ دار اُس رحمت و مودت کے بھی مستحق ہو جاتے ہیں۔ جو ہم بچوں سے ظاہر کرتے ہیں وہی ایثار جو ہم اپنے گھر میں برتتے ہیں۔ وہی دوسرے رشتے داروں کے حق میں بھی ایک حد تک ظاہر ہوتا ہے۔ رشتے داروں کی ذیل میں ہی وہ افراد بھی آجاتے ہیں جن سے رشتہ اتحاد و دوستی قائم ہوتا ہے۔ یہ دائرہ محبت یہیں ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ وسعت پاکر دوستوں کے بعد ہم قوم وہم مذہب

اور پھر اُن کے بعد ہم ملک کو بھی اپنے اندر لے لیتا ہے۔ انسانی ہمدردی اس دائرے کو اور بھی وسیع کر کے انسانی محبت و رحمت کا مورد کل بنی نوع کو بنا لیتی ہے اس کے بعد ایک ہی منزل باقی رہ جاتی ہے۔ کہ جب انسان ربانی اخلاق سے متصف ہو جاتا ہے۔ تو اس کی محبت و رحمت مخلوق الٰہیہ کے ہر نوع و صنف تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ وہ مقام ارفع ہے کہ جہاں انسان رب العالمین کا مظہر اتم ہوتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ جو محبت۔ رحمت۔ ہمدردی یا ایک لفظ میں شفقت وہ اپنے دائرہ اعیال میں ظاہر کرتا ہے۔ وہی شفقت وہ مخلوق الٰہیہ کی ہر نوع سے علیٰ قدر مراتب ظاہر کرے جس طرح ہر عالم میں ارتقا کی سات ہی منزلیں ہیں۔ وہی سات منازل یہاں بھی موجود ہیں جن میں سے گذر کر بہیمیت و سبعیت یعنی شہوت و غضب وہ روحانیات بن جاتی ہیں جس کی ہمسائگی میں الوہیت کھڑی ہے یہی وہ حقیقت ہے۔ جسے قاب قوسین کہتے ہیں جہاں انسانی قوس کا وتر الٰہی قوس کے وتر سے جا ملتا ہے۔ ان سات منازل کو میں پھر گن جاتا ہوں۔ حکیمانہ اصطلاح میں طبعی جذبات کا احساس اور اُن کے تقاضوں کے تہیہ کے فکر کا من کل الوجوہ مفہوم ایک لفظ ادراک سے ادا ہوتا ہے یعنی ہمارا اپنی راحت و تکلیف کو محسوس کرنا پھر جلب منفعت اور دفع مضرت کا علاج سوچنا سب لفظ ادراک میں آجاتا ہے اس ادراک کی پہلی شکل وہی بہیمیت و سبعیت اور اس کے تقاضے ہیں جسے فلسفی اصطلاح میں ادراک حیوانی کہا گیا ہے۔ یہ ادراک بطور مواد کے ہے۔

جیسے عربی زبان میں **بلغم** کہتے ہیں۔ اسی میں سب استعدادیں اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ موجود ہیں اسی نے ترقی کر کے اخلاق فاضلہ اور روحانیت بننا ہے۔ لیکن اس نے بلوغت یعنی ارتقاء کی سات منزلیں طے کر کے اس کمال حقیقی کو پہنچنا ہے جسے قرآن **صبغۃ اللہ** کہتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر انسان خدا تعالےٰ کا مظہر اتم ہو جاتا ہے۔ اور خدا اُس کے ہاتھ پاؤں اور روح ہو جاتا ہے۔ جیسے حدیث شریف میں آیا ہے۔ اور اس کی ارتقائی سات منزلیں یہ ہیں۔

اوّل۔ ادراک ذاتی	**پنجم**۔ ادراک ملکی
دوم۔ ادراک منزلی یا اہلی	**ششم**۔ ادراک نوعی
سوم۔ ادراک اصدقائی	**ہفتم**۔ ادراک کونی
چہارم۔ ادراک قومی وملّی	

یہاں اِن ادراکات مختلفہ سے مراد یہ ہے کہ جس طرح انسان اپنی ضرورت کو محسوس کرتا ہے اور اُس کے دفعیہ کی فکر میں ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ اہل و عیال، رشتہ داروں، دوستوں، ہم قوموں، ہم ملکوں، ہر نوع انسان وغیرہ کی ضروریات کو اپنی ضرورت کی طرح محسوس کرے۔

انسان دنیا میں ادراک حیوانی لے کر آتا ہے۔ لیکن جب اس ادراک سے آگے چلتا ہے۔ تو اس کے مدارج رفعت بھی اس کے ساتھ بڑھتے جاتے ہیں۔ وہ جس درجے کے ادراک کو لے کر اس جہان سے رخصت ہوتا ہے۔ وہی درجہ

رفعت اُسے اگلے جہان میں ملتا ہے معراج والی حدیث میں ہمارے نبی کریمؐ نے جناب آدمؑ کو تو پہلے آسمان پر دیکھا اور باقی نبیوں کو باقی کے آسمانوں پر۔ ان میں سے جناب مسیحؑ تو چوتھے آسمان پر تھے اور اولوالانبیاء جناب ابراہیم علیہ السلام ساتویں آسمان پر۔ مذکورہ بالا نظریہ کی روشنی میں یہ عرفانی حقیقت بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے۔ جناب آدمؑ کے ارد گرد اُن کا اپنا ہی اہل و عیال تھا۔ ان کا ادراک پہلی منزل پر تھا۔ انجیل میں جو جناب مسیحؑ کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ وہاں اُن کا ادراک قومی ادراک سے آگے نظر نہیں آتا۔ وہ اپنی ہمدردی اور ہدایت کو اسرائیلی قوم تک محدود رکھتے ہیں۔ وہ اپنا مشن اسرائیلی بھیڑوں تک محدود کرتے ہیں وہ سوروں کے آگے موتی پھینکنا اور کُتوں کے آگے بچّوں کی روٹی ڈالنا نہیں چاہتے کُتوں اور سوروں سے اُن کی مراد غیر مختون قومیں ہیں۔ نہ معلوم یہ غیر مختون قومیں کیوں خوشی سے عیسویت کے جوئے تلے آگئی ہیں۔ وہ اگر آہ و واویلا کرتے ہیں تو بنی اسرائیل کے لیٔے۔ نہ کسی اور قوم یا نسل انسانی کے لیٔے۔ اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ اُن کا ادراک چوتھے درجے پر تھا۔ جناب موسےٰ اگر ان سے اگلے آسمان پر نظر آتے ہیں۔ تو ظاہر ہے۔ کہ وہ اسرائیلیوں کے علاوہ قبطیوں کو بھی اپنے دائرہ ہدایت میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جناب ابراہیمؑ کا نقشہ جو قرآن شریف اور بائیبل ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ وہاں اُن کے اخلاق۔ اُن کی ہمدردی۔ اُن کا احساس انسانیت اپنی قوم سے آگے چل کر ہر بنی نوع

کے لئے یکساں نظر آتا ہے۔ قوم لوط کو عذاب سے بچانے کے لئے وہ خدا سے ملتجی ہیں۔ گو وہ قوم اُن سے تعلق نہیں رکھتی۔ اُن کا دستر خوان ہر قوم و ملت کے انسانوں کے لئے کھلا ہے جس میں وہ کوئی قومی وملّی ولسانی ولونی تمیز نہیں کرتے لہٰذا یہ امر ضروری تھا کہ ان وسیع اخلاق کا انسان عالم بالا میں ساتویں آسمان پر ہی نظر آئے لیکن خاتم النبیینؐ کے ادراک کا نقشہ قرآن کریم نے جن الفاظ میں کھینچا ہے وہ اس سے بھی ارفع ہے۔ قل ان صلاتی ونسکی و محیای ومماتی للہ رب العلمین یعنی اُن کا مرنا جینا اُن کی زندگی کے سب کام اُس ہستی کی خدمت اور اُس کی منشاء کو پورا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جو تمام مخلوق کا ربّ ہے۔ اس مقام عظمیٰ کے ادراک والا اپنے معراج میں اگر ساتوں آسمانوں سے گذر کر عرش عظیم تک نہ پہنچے تو پھر اور کون پہنچے۔

قرآن کریم نے ایک ایک طبقہ مخلوق الٰہیہ کو لے کر اُسے انسان کی محبّت اور شفقت کا مورد بنایا۔ پھر مختلف راہیں اور طریق بتلائے جن سے رحمت اور محبّت کا بیج فطرت انسانی میں سے نکل کر ایک ایسا باثمر درخت بن جائے۔ کہ جس کے سایہ تلے مخلوق الٰہی آجائے۔ پھر ان تمام وجوہ کو جو اس رحمت و محبّت عامہ کی راہ میں روک ہو جائیں۔ سامنے رکھ کر مختلف تعلیمات سے اُن سب کا قلع قمع کیا وہ باتیں جن سے غیریت واجنبیت لاپروائی کینہ عداوت پیدا ہوں۔ انہیں گناہ اور بدی قرار دیا۔ الغرض کتاب حمید نے ایک ایسا نظام ابلغ تجویز کیا۔ کہ جس سے

بہتر مذہب محبت کی تدوین کہیں اور نظر نہیں آتی۔ میں ان صفحات میں ان تمام باتوں کی تفصیل کی گنجائش نہیں دیکھتا۔ میں اس کتاب کے خاتمہ پر قرآن کریم سے چند آیات کو نقل کر دیتا ہوں۔ جن میں ایک مسلم مخلوق الٰہیہ کے مختلف طبقات سے محبت و شفقت کرنے کے لئے مامور کیا گیا ہے خدا تعالیٰ نے توفیق دی۔ تو پھر اس مضمون پر بالاستیعاب لکھوں گا۔

آنحضرت صلعم کے وقت سے لے کر آج تک ہر نماز جمعہ کے خطبہ میں منبر سے ایک آیت سنائی جاتی ہے جس میں ایک مسلم کو انہی ادراکات مذکورہ بالا کے نشو و نما میں لانے کی تحریک کی جاتی ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ [1] ○ (النحل ۹۰)

اس آیت کے دو ٹکڑے ہیں پہلے حصے میں چند محاسن کا ذکر ہے جن کی طرف ترغیب دلائی جاتی ہے اور دوسرے میں چند بدیوں کا ذکر ہے۔ جس سے انسان کو روکا گیا ہے۔ اور اخیر میں یہ کہا گیا ہے کہ مسلمانو ان باتوں کو نہ بھولنا۔ بلکہ اٹھو پہر یاد رکھنا۔ میں پہلے حصے کو لیتا ہوں۔ اس میں تین باتوں کی طرف ہمیں متوجہ

---

[1] (ترجمہ) اللہ تمہیں عدل اور احسان اور قریبیوں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور برائی اور زیادتی سے روکتا ہے وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔

کیا گیا ہے۔ عدل ۔احسان اور وہ شفقت جو ایک شخص اپنے اہل وعیال کے ساتھ کرتا ہے۔ عدل سے مراد اپنے حقوق لے لینا اور دوسروں کے حقوق کی عزت کرنا۔ اس کے بعد پھر حسنات کا باب شروع ہوتا ہے۔ احسان عموماً ان لوگوں سے کیا جاتا ہے جن کا کوئی حق ہم پر نہ ہو۔ بلکہ کسی تعلق کے بغیر ہم دوسروں سے نیکی کریں۔ احسان کنندہ علی العموم احسان یافتہ سے کسی نہ کسی امر کی توقع رکھتا ہے۔ خواہ وہ از قسم تشکر وامتنان کے رنگ میں کیوں نہ ہو۔ لیکن انسان کی فطرت میں اس قسم کی نیکی کرنے کے بھی جوہر ہیں کہ وہ بلا کسی عوضہ یا تشکر یا استحسان کی اُمید کے دوسروں سے نیکی کرتا ہے۔ بلکہ اس کا احسان یافتہ اگر اُس کے خلاف مرضی بھی کوئی کام کرے۔ یا اُسے تکلیف بھی دے۔ لیکن اُس کی طرف اس کی نیکی دریا کے پانی کی طرح بہتی چلی جاتی ہے۔ یہ بہت ہی بلند اور مشکل مقام ہے۔ لیکن اس مقام پر پہنچے ہوئے قریباً کل کے کل انسان اپنے گھروں میں نظر آتے ہیں۔ اپنے بچوں سے جو ہم حسن سلوک کرتے ہیں۔ وہ کسی اجر یا تشکر کو نہیں چاہتا۔ ان کی بدعنوانیاں بھی ہمیں نیکی کرنے سے باز نہیں رکھتیں۔ قرآن کریم نے اس آیت میں ایتائِ ذالقربیٰ فرما کر اشارہ کیا۔ کہ تم میں جو محبت اور شفقت کا رنگ اقارب کے معاملے میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ امر تم کو ہر ایک مخلوق الٰہیہ کے معاملہ میں ظاہر کرتا ہے۔

ادراک حیوانی اور ادراک انسانی میں جو امر بطور مابہ الامتیاز ہے وہ ادراک

ذاتی ہے۔ حیوان ہر ایک چیز کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے جس وقت اس کے قوائے شہوانی محرک ہوتے ہیں۔ اُس وقت جو چیز بھی اس کے سامنے آجائے اس پر منہ مارنے سے وہ نہیں ٹلتا۔ ایک گائے بھوک کے وقت کسی غیر کی کھیتی میں منہ ڈال دیتی ہے۔ اُسے نہ یہ سمجھ ہے اور نہ پروا۔ کہ اس کھیت کا مالک اس کا مالک نہیں۔ ہزاروں انسان ہر جگہ ایسے ہی نظر آتے ہیں۔ جن میں حیوانی خاصہ ہوتا ہے۔ ہاں انسان میں یہ استعداد ہے کہ وہ اپنی اور غیر کی چیز میں تمیز کر سکے۔ یہی تمیز جب صحیح طور پر کام کرنے لگتی ہے۔ تو دنیا میں امن اور نصفت شعاری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس تمیز صحیحہ کا نام **ادراک ذاتی** ہے۔

ادراک حیوانی کو ادراک ذاتی میں تشکل کرنے کے لئے قرآن کریم نے آیت زیر بحث میں سب سے اوّل عدل کا حکم دیا جس سے مراد یہ ہے۔ کہ جو تمہاری چیز ہے تم لے لو اور جو دوسروں کی چیز ہے وہ دوسروں کو دے دو۔ اس عدل کی قوت کو مضبوط کرنے کے لئے مختلف مقامات میں امانت پر زور دیا ہے چنانچہ ایک جگہ فرمایا۔ ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الیٰ اھلھا۔ جو چیز بطور امانت تمہارے پاس ہے وہ اُن کے مالکوں کو دے دو۔ جس وقت انسان قوت عدل اور اُس کے استعمال میں مستحکم ہو جاتا ہے۔ اور کبھی کسی ایسی چیز پر نگاہ تک نہیں ڈالتا۔ جو اُس کی نہ ہو تو پھر قرآن کریم اُسے احسان کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یعنی جو چیزیں اُس کی اپنی ہیں۔ وہ دوسروں کو دے۔

احسان کے پہلے عدل کا ذکر کرکے اس قسم کے احسانوں کا قلع قمع کر دیا۔ جو چوروں خائنوں دوسروں کا مال مارنے والوں سے بھی سرزد ہوتے ہیں۔ دنیا میں لکھو کھہا انسان اپنی فیاضی میں تو حاتم ثانی ہوتے ہیں لیکن اُن کی سخاوت جس مال سے ہوتی ہے۔ وہ صدہا غیروں کی حق تلفیوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ صحیح احسان کا ظہور اپنی ہی مکسوبات سے ہوتا ہے۔ پھر اس احسان میں جو عنصر ضروری ہے جس سے انسان اخلاق الٰہیہ کا مظہر بن جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان غیروں کے ساتھ اُسی رنگ میں احسان کرے۔ جیسے اپنے بال بچوں عیال و اقارب سے کرتا ہے انسان میں یہ قوت تو ہے جیسے مَیں نے پہلے بیان کیا۔ لیکن اس قوت کو بار ور کرنے کے لئے ایک اور موقعہ پر فرما دیا۔ کہ انسانوں کو جو کچھ ہم نے عطا کیا۔ اُس کے اعضاء جوارح اس کی قوتیں اس کی استعدادیں یہ سب کے سب ہماری طرف سے اُس کے پاس بطور امانت ہیں۔ اور انسان اس عطیہ کو بطور امانت سمجھنے کا اہل بھی ہے۔ جیسے کہ فرمایا۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ
حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝

(ترجمہ) یعنی ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا۔ تو اُنہوں نے انکار کیا۔ کہ اس کا بوجھ اُٹھائیں اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کا بوجھ اُٹھا لیا۔ وہ اپنے نفس پر ظلم کرنے والا اور نہ جاننے والا ہے (الاحزاب ۷۲)

یہ صداقت حقہ ہے۔ انسان کے سوا کل مخلوقات کو دیکھ لو۔ ان میں ضرورت وقتی کے دفعیہ سے زیادہ اسباب دفعیہ ضرورت سے تمسک کی استعداد نہیں ہوتی جانوروں میں ہی دیکھ لو۔ ہر ایک وقتی ضرورت کا ہی علاج کرتا ہے۔ آئندہ کے لئے کسی چیز کو پس انداز کرنے کی اُن میں استعداد ہی نہیں ہوتی۔ اس قاعدۂ عامہ میں اگر استثنا ہے تو صرف چند جانوروں میں جو سال کے کسی حصہ میں اپنے مامن یا جگہ سے باہر نہیں نکل سکتے۔ مثلاً چیونٹی یا ریچھ یا چند ایک اور جانور سردیوں میں یہ اپنی جگہ سے باہر نہیں نکل سکتے اس لئے سرما کی خوراک کے لئے وہ کچھ نہ کچھ پس انداز کر لیتے ہیں لیکن ان میں یہ ادراک پس اندوختگی بھی محدود ہی ہوتا ہے۔ ان کا ادراک آیندہ موسم سے آگے تک نہیں جاتا۔ بالمقابل انسان کو دیکھ لو اسے اگر مساعدہ حالات میسّر آجائیں۔ تو وہ ساری عمر کے واسطے نہ صرف اپنے ہی لئے بلکہ اوروں کے لئے بھی مایحتاج آسانی سے جمع کر لیتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے انتھک قوائے اپنی ذاتی ضرورت سے زیادہ چیزیں پیدا کر سکتے ہیں۔ آخرش اس ربانی اقتصاد کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ سب قوئے اور استعدادیں اُس کی اپنی ذات کے لئے نہیں ہیں۔ بلکہ اوروں کے لئے دی گئی ہیں۔ یہ بطور امانت ہیں اور ان امانات کی اہل خدا کی کل مخلوق ہے۔

الغرض ایک طرف تو انسان میں ادراک ذاتی پیدا کر کے اُسے عدل کیطرف

متوجہ کیا۔ دوسری طرف اس میں احسان اور ایتاء ذی القربےٰ والی نیکی کرنے کے جوہر رکھ کر اُسے اطلاع دی کہ تجھے جو کچھ دیا گیا ہے وہ بطور امانت دیا گیا ہے پھر انسان میں فطرتاً رضامندی خداوندی کے حصول کی خواہش ہوتی ہے خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھے۔ اسلئے خوشنودی خداوندی اس کا نصب العین ہوتا ہے۔ قرآن نے خوشنودی خداوندی کے حصول کا ذریعہ بھی حسنات خیرات اور احسان ہی بتلایا۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ خدا کا غصہ حسنات وخیرات سے دور ہو جاتا ہے الصدقت تطفی غضب ربی۔

انسان میں ایک اور بھی تڑپ ہے وہ چاہتا ہے کہ اُس میں خدائی رنگ پیدا ہو جائے۔ اسی خواہش نے بعض ربانی رنگ میں رنگین انسانوں کو عام نگاہ میں خدا کر دکھایا عیسٰی۔ عذرا۔ کرشن۔ رامچندر۔ زرتشت اسی لئے اللہ اور ابن اللہ کہلائے۔ اسلام کی رو سے بھی نفس ناطقہ کی تکمیل کا مقام یہی ہے۔ یعنی جب انسان سے اخلاق خداوندی سرزد ہوں حدیث نبویؐ کے الفاظ تخلقوا باخلاق اللہ[1] بھی اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اب جس خدا کا نقشہ قرآن مجید نے کھینچا ہے۔ اس کے یوں تو ننانوے صفات ہیں لیکن ان سب صفات کی اُم چار صفات ہیں۔ رب۔ رحمٰن۔ رحیم۔ مالک یوم الدین۔ اب جو خدائی رنگ اپنے میں پیدا کرنا چاہے وہ انسانی احاطہ میں ان صفات کا متصف

---

[1] ترجمہ) اپنے اندر اللہ کے اخلاق پیدا کرو

اپنے آپ کو بنائے۔ مالک یوم الدین۔ وہ خدا ہے جو کسی کا حق نہیں رکھتا جو جس کا مستحق ہو وہ اُس کو دے دیتا ہے۔ اس صفت کے ماتحت انسان میں لازماً صفت عدل پیدا ہو جاتی ہے اس سے آگے چل کر رحیمیت کی شان مخلوق کو ایک کے عوض میں دس سو یا اس سے بھی زیادہ بخشتی ہے یہ رنگ احسان کا ہے اس سے آگے چل کر صفت رحمانیت بلا عوضہ بلا تمیز قوم و ملت ہر ایک کے لئے درفیض کھول دیتی ہے۔ انسانی دائرہ میں یہ رنگ ایتاء ذی القربیٰ سے سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ خدا کے حقیقی پرستار خدا کی راہوں پر چلتے ہیں۔ اس لئے حقیقی رحمٰن کا بندہ وہی ہوتا ہے جس کی ایتاء ذی القربیٰ والی نیکی دائرہ اہل وعیال سے نکل کر ہر مخلوق الہٰی تک پہنچے۔ شان ربوبیت کے تو کیا کہنے۔ وہ سب کا پالنہار۔ سب کا رزاق۔ سب کا قیوم اور سب کی استعدادوں کو حد بلوغت تک پہنچانے والا ہے۔ اب جس کا جی چاہے۔ خدائی رنگ میں رنگین ہو جائے لیکن اگر قرآنی خدا کے صفات سے متصف ہونا چاہے۔ تو پھر اُس سے بڑھ کر **مذہب محبّت** کا کامل عامل اور کون ہو سکتا ہے؟

جس بات نے مجھے حیران کر رکھا ہے۔ وہ قرآن کا وہ نظام ابلغ ہے۔ کہ جس کے ماتحت کل کا کل قرآن الہٰی مختلف آیات سے اس طرح مربوط ہے۔ کہ اس کی ایک آیت بھی دوسرے کے نقیض نہیں پڑتی۔ اگر ایک جگہ اصول محکمات دئے ہیں۔ تو دوسری جگہ ان کی تشریح کر کے وہ ہدایات فرما دی ہیں کہ جن پر

چل کردہ اصول صداقت مثبتہ ہو جائیں۔ اس معاملہ میں اس امر زیر بحث کو دیکھو۔ اگر مذہب محبت کو دُنیا میں قائم کرنے کے لئے یہ حکم دیا۔ کہ تم خدا کے صفات اپنے اندر پیدا کرو۔ تو پھر ایک طرف خدا کے صفات وہ دئے۔ جو مذہب محبت کی جان ہیں اور جن کے رنگ میں رنگین ہو کر **ادراک حیوانی** ادراک ذاتی بن کر مختلف منازل طے کرتا ہوا **ادراک کونی** ہو جاتا ہے۔ اگر مالک یوم الدین کا مظہر وہی شخص ہو سکتا ہے۔ جس میں ادراک ذاتی صحیح شکل میں پیدا ہو جائے تو رحیم اور رب العلمین کا مظہر بھی وہی انسان ہو سکتا ہے۔ جس میں یکے بعد دیگرے کل ادراک پیدا ہو کر آخر کار ادراک کونی بصورت اتم پیدا ہو جائے۔ یہ باتیں کس طرح حاصل ہوں۔ اس کے لئے ہر جمعہ کی نماز میں جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا۔ آیت ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتائ ذالقربیٰ پڑھوائی۔ جس کا دوسرا ٹکڑا ان بدیوں کو روکتا ہے۔ جو اُن ادراکات کے پیدا ہونے میں مانع ہے۔ آنحضرت صلعم نے اگر بچوں کے نام رکھنے کے متعلق یہ فرمایا۔ کہ خدا کے نام پر نام رکھو۔ مثلاً عبد الرب عبد الرحمٰن۔ عبد الرحیم۔ عبد المالک تو اس کی بھی یہی حقیقت تھی عبد المالک وہی ہے۔ جس میں ادراک ذاتی کامل طور پر نشو و نما پا گیا ہو۔ عبد الرحیم عبد الرحمٰن اور عبد الرب وہی کہلا سکتا ہے۔ جس میں ادراک ذاتی کے بعد ادراک منزلی۔ ادراک اصدقائی۔ ادراک قومی۔ ادراک ملکی۔ ادراک نوعی

اور ادراک کونی پیدا ہو جائیں۔

اب میں ذیل میں قرآن مجید کی چند آیات لکھ دیتا ہوں۔ جن میں ان ادراکات کے پیدا کرنے کی ہدایات فرمائی گئیں۔ مَیں ان میں اس ترتیب کا عدم فرصت کے باعث لحاظ نہیں رکھتا۔ جس سے ان ادراکات مختلفہ کا الگ الگ تعلق ہے۔

شروع میں مَیں چند آئتیں ایسی بھی دے دیتا ہوں جو انسان کو عفو کی طرف مائل کرتی ہیں۔ کیونکہ دوسروں کی خطائیں بعض وقت مانع محبت ہو جاتی ہیں۔ بعض وقت انسان کی متکبرانہ طبیعت اُسے اُن لوگوں کی طرف مائل ہونے نہیں دیتی۔ جن کی طرف توجہ کرنا ہی اُس کے اخلاق کی تہذیب کا موجب ہو جاتا ہے۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ
إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۝ وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ
وَاغْضُضْ مِن صَوْتِكَ ۚ (لقمان ۱۸-۱۹)
الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ
الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝ (آل عمران ۱۳۴)
وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي
هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ

كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝ (حٰمٓ - ۳۴)

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝
وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ
اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (الاعراف ۱۹۹ - ۲۰۰)

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ
جَزُوْعًا ۝ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۝
الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ
فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝

(المعارج ۱۹ تا ۲۵)

فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝
يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝
ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ
وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝

(البلد ۱۳ تا ۱۸)

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ
اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ
وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ

بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ

(النساء ٣٦)

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ
اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا
اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ
لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ
الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ - وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ
وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝
اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ؕ وَلَا
تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا
كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۝ اِنَّ رَبَّكَ
يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ

(بنی اسرائیل ٢٣-٢٤-٢٦-٢٧-٢٩-٣٠)

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ
وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِىْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِىْ
وَلِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَىَّ الْمَصِيْرُ (لقمان ١٤)

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ

وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا
مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (البقرہ ۲۱۵)

وَاَمَّا اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ
فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۚ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۙ
وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۙ (الفجر ۱۶-۱۷-۱۸)

عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ۙ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ۝ قَالُوْا لَمْ
نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۙ
(المدثر ۴۱ تا ۴۴)

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّ
اَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا
نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝ (الدہر ۸-۹)

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ
تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ
وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ (البقرہ - ۲۷۱)

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ
فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ

اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝

(الممتحنہ ۸)

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَكُمْ قِـبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰي حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَـتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّاۗىِٕلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰھَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (البقرہ-۱۷۷)

ان آیات کا کھلا کھلا ترجمہ میں یہاں دے دیتا ہوں :-

حقارت یا نفرت سے دوسروں سے منہ نہ پھیرا کرو نہ متکبرانہ طریق پر سر اُٹھائے زمین پر چلا کرو- اللہ تعالیٰ فخر کرنے والوں اور خود پسندوں سے محبّت نہیں کرتا- چلنے میں صحیح راستہ پر قدم رکھو- آہستہ بولا کرو- اور اونچی آواز نہ کرو- (یہ بھی ایک تکبر ونخوت کی ایک نشانی ہے) متقی لوگ وہی ہیں- جو تکلیف وراحت میں خیرات کیا کرتے ہیں- غصہ کو دبا لیتے ہیں- اور لوگوں کے گناہ معاف کر دیتے ہیں- اللہ تعالیٰ محسنین کو ہی پسند کرتا ہے- نیکی تو بدی کے برابر نہیں ہوتی (اگر کوئی تم سے بدی کرے یا تکلیف دے) تو بدی کا عوضہ کسی بہتر طریق پر کیا کرو-

بدی کے عوض نیکی کر چھوڑا کرو۔ دیکھ لینا ۳۱ اطریق سے وہ بھی جو تمہارا دشمن ہو گہرا دوست بن جائے گا۔ عفو سے کام لیا کرو۔ اور نیکی کیطرف لوگوں کو متوجہ کرو۔ اگر کسی جاہل سے معاملہ پڑے۔ تو اُن سے اعراض ہی کر لیا کرو۔ اگر کوئی شیطان (نش) کوئی الزام بھی لگائے۔ اور اُس سے تمہیں تکلیف ہو۔ (تو بہتر یہی ہے) کہ خدا کی طرف ہی رجوع کیا کرو۔ وہ سب کچھ جانتا اور سب کچھ سنتا ہے۔ انسان کی طبیعت میں شتاب کاری ہے۔ مصیبت آئے تو گھبرا جاتا ہے۔ بالمقابل جب اس کے حالات اچھے ہو جائیں تو پھر ممسک ہو جاتا ہے۔ (اس کا علاج یہی ہے) کہ نماز پڑھو۔ اور آٹھ پہر خدا کی یاد میں لگے رہو۔ اور اپنے مال و دولت میں سے ایک حصہ الگ کر دو۔ جو فقراء کے کام آوے۔ اور ایسی مخلوق کے جو (ذرائع روزی سے) محروم ہو (محروم کی مد میں کتا۔ بلی وغیرہ سب جانور بھی آ جاتے ہیں) (تمہارے سامنے بڑے بڑے مشکل کام ہیں) لیکن سب سے بڑی مہم کا حل کرنا اسی میں ہے کہ غلاموں کو آزاد کیا جاوے۔ قیدیوں کو قرضداروں کو نجات دلائی جاوے (یہ لوگ بھی غلاموں کی ذیل میں آ جاتے ہیں) بھوکوں کو کھانا کھلایا جاوے ایسا ہی رشتہ کے یتیموں اور ایسے غربا کو بھی جو مٹی میں مل گئے ہوں۔ یہی اچھے راہ پر چلنے والے لوگ ہیں اور وہ شخص بھی (ہدایت یافتہ ہے) جو (خود) مومن ہو (ان باتوں پر عمل کرتا ہو) اور دوسروں کو بھی صبر و شفقت کا سبق دیتا ہو اللہ تعالیٰ کو ہی معبود سمجھو۔ اور کسی کو اُس کے ساتھ شریک نہ کرو اور یاد رکھو کہ خدا

کے بعد دوسرا درجہ والدین کا ہے۔ وہاں جو باتیں والدین خدا کے کسی حکم کے خلاف
کہیں وہ تو نہ کرو۔ لیکن اُن سے نہایت نرمی سے سلوک کرو۔ والدین کے ساتھ
احسان کرو۔ اور اُن کے بعد رشتہ داروں سے۔ یتیموں سے اور مسکینوں سے
اور ہمسایوں سے۔ ہمسائیوں میں نہ صرف وہی ہمسائے شامل ہیں۔ جو تمہارے
رشتہ میں ہوں۔ بلکہ ایسے ہمسایہ بھی جو اجنبی اور غیر ہوں (خواہ وہ کسی قوم
وملت کے ہوں) ایسا ہی جو تمہارا رفیق سفر ہو۔ یا کوئی راہ چلتا ہو۔ اس کے ساتھ
بھی احسان کرنا چاہیئے خدا کا یہی حکم ہے۔ کہ اُسی کے حکموں کو مانو اور والدین سے
محبت کیا کرو (خصوصًا) جب اُن میں سے کوئی ضعیفی کی عمر تک پہنچ جاوے
ان سے سختی سے پیش آنا تو درکنار اُن کے آگے اُف تک نہ کیا کرو۔ جب
اُن سے بولو۔ نرمی سے بولو۔ رشتہ داروں سے مسکینوں سے راہ چلتوں سے
نیکی کرو۔ لیکن فضول خرچ مت بنو۔ فضول خرچ شیطان کے بھائی ہوتے
ہیں۔ (بالمقابل) خیرات کرنے میں ہاتھ بالکل ہی نہ روک لو۔ اور نہ بالکل ہاتھ
ایسا کھلا کر لو۔ کہ تمہارے پاس کچھ بھی نہ رہے۔ (اور اُلٹے) لوگ تم پر ملامت
کریں (یہ خیال نہ کرنا) کہ خیرات سے کوئی غریب ہو جاتا ہے۔ اللہ جس پر
چاہے رزق کے دروازے کھول دیتا ہے۔ ہم نے (خدا) انسان کو والدین
کے متعلق بہت تاکید کی ہے۔ (اوّل تو) اس کی ماں ضعف اور کمزوری کے
ساتھ اُسے (حمل میں) اُٹھائے پھرتی ہے پھر دو سال اس کی رضاعت میں

ختم ہو جاتے ہیں۔ تم ہمارے (خدا کے) شکرگذار بنو اور اپنے والدین کے شکرگذار بنو۔ آخر کار تم نے ہماری طرف ہی آنا ہے (اگر دولت مند اپنی دولت کا مصرف نہیں جانتے) تو انہیں کہہ دو۔ کہ تم اپنی دولت اپنے والدین اپنے اعزا۔ یتیم۔ محتاج مسافروں پر خرچ کیا کرو۔ (اور یہ تمہاری خیرات ضائع نہیں جاتی) جو نیکی بھی کرو گے۔ خدا اُسے یقینی جانتا ہے۔ جب کسی انسان کو خدا تعالےٰ ابتلاء میں ڈالتا ہے اور اس پر تنگ دستی وارد ہو جاتی ہے۔ تو وہ کہتا ہے کہ میرے خدا نے مجھے ذلیل کر دیا (نہیں ہم نے نہیں ذلیل کیا اس کی وجہ تو یہ ہے) کہ تم یتیموں کی عزت نہیں کرتے تھے۔ اور غربا کی پرورش کے لئے ایکدوسرے کو ہدایت نہیں کرتے تھے۔ (اپنے ہی مال میں مست ہو۔ اس کا ہی یہ نتیجہ ہے) (مجرم جہنم میں آئینگے اور پوچھے جائیں گے کہ) تمہیں جہنم میں کون لایا۔ وہ کہیں گے۔ کہ ہم نہ خدا کو یاد کرتے تھے نہ غرباء کی پرورش کرتے تھے (نیک لوگ دکھاوے سے یا ریاکاری سے یا دُنیا کو خوش کرنے کے لئے خیرات نہیں کیا کرتے وہ تو محض محبّت خدا میں غرباء کو یتامیٰ کو اور قیدیوں کو (جو کسی قسم کی قید میں ہوں) ان سب کو کھانا دیتے ہیں (اور اپنے احسان یافتہ کو کہتے ہیں) کہ ہم تو محض خدا کے لئے تمہیں کھانا دیتے ہیں۔ ہم تم سے کوئی عوض نہیں رکھتے۔ نہ کوئی بدلہ تم سے چاہتے ہیں (نیکی اور احسان کا یہ رنگ وہ ہے کہ جس سے انسان میں ادراک ذاتی اور ادراک منزلِ واصد فانی کے بعد دوسرے ادراک آہستہ آہستہ پیدا ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ ادراکات اُسی وقت پیدا ہوتے ہیں۔ جب انسان اپنے احسان یافتوں کی طرف کسی عوضہ یا

شکر گذاری کے لئے نہیں دیکھتا۔ان ادراکات کی استعداد میں اور بھی قوتِ نشوونما پیدا ہو جاتی ہے۔جب خیرات انسان پبلک کے علم کے بغیر کرتا ہے کیونکہ جب ریاکاری یا خیال عوضہ وتشکر خیرات کے وقت اُس کے سر سے نکل جاتا ہے۔تو پھر اُس کی خیرات ہر طبقہ تک پہنچ جاتی ہے۔البتہ خیرات کو دکھاکر کرنا بھی خالی از فائدہ نہیں ہوتا اس سے دوسروں کو بھی تحریک ہو جاتی ہے۔اس لئے فرمایا کہ) اگر تم خیرات کھلے طور سے دو۔وہ بھی بہتر ہے۔لیکن اگر چھپا کر دو۔اور غربا کو دو تو یہ بہت بہتر ہے اس سے تمہاری غلط کاریاں تم سے دور ہو جاتی ہیں۔اور خدا تو سب کو جانتا ہے۔(در اصل ریا سے ہی انسان میں تفاخر اور اس کے بعد غرور اور پھر تکبّر کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔اور یہ کل گناہوں کی جڑ ہے۔اس کا علاج یہی ہے۔کہ خیرات پوشیدہ کی جائے) غیر مسلموں سے (جن سے جنگ ہو اُن کے سوا سب سے) نیکی اور مروّت سے ہی سلوک کرنا (چنانچہ فرمایا کہ) خدا تعالےٰ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور نصفت[ا] شعاری سے نہیں روکتا جو نہ تم سے جنگ کرتے ہیں اور نہ جنہوں نے تمہیں گھر سے نکالا۔ اللہ تعالےٰ نصفت شعاری کو پسند کرتا ہے اگر کوئی بُت پرست یا مشرک بھی تمہاری پناہ میں آجاوے اُسے ضرور پناہ دو۔خدا کی باتیں بھی سناؤ اور اُسے امن کی جگہ تک پہنچا دو۔یہ لوگ صاحب علم نہیں نیکی اور راستبازی اس چیز کا نام نہیں کہ مشرق یا مغرب کی طرف منہ کر لو۔نیکی اسی میں ہے کہ خدا۔یوم آخر۔ملائکہ خدا کی کتب اور اس کے نبیوں پر ایمان لاؤ۔اور محض خدا کی محبت میں اپنے

[ا] بھلائی کرنا۔

مال کو اقربا پر۔ یتامیٰ پر۔ مسکینوں پر۔ راہ گیروں پر۔ سائلوں پر اور جو کسی قسم کی مصیبت میں ہوں اُن کے چھڑوانے پر خرچ کرو۔ نمازیں پڑھو اور خدا کو یاد کرو۔ زکوٰۃ دو۔ وعدے پورے کرو مصیبت اور تکلیف کیوقت صبر دکھلاؤ دنیا کے بعض مذاہب رسمیات بعض معتقدات اور بعض عملیات پر زور دیتے ہیں یہ تینوں باتیں اپنی اپنی جگہ فائدہ سے خالی نہیں۔ قرآن نے یہاں ان تینوں امور کو بطریق مناسب جمع کر دیا۔ اس آیت نے تو حقیقت مذہب کو کس خوبصورتی سے واضح کر دیا۔ مذہب کسی رسم ورواج کا نام نہیں مذہب تو ہمدردیٔ انسانی کا نام ہے اوران باتوں کے کرنے کا نام ہے کہ جس سے انسان کا جان ومال حفاظت میں آکر انسان کو کامل متمدن اور با اخلاق بنا دے چونکہ معتقدات ہی ہمارے اعمال کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔ اس لئے اس آیت میں ضروری اعتقادات کا بھی ذکر کر دیا گیا۔

ان آیات پر عمل کرنا گویا ادراکات مذکورہ بالا کی بہترین آبیاری کرنا ہے مخلوق الٰہی کا کوئی طبقہ بھی مجھے ایسا نظر نہیں آتا۔ جسے انسانی شفقت کا مورد بنانے کے لئے آیات میں ہدایات نہ ہوں۔

فضلائے مسیحیت نے مذہب محبّت کی فہرست میں جہاں بدھ مذہب کو داخل کیا۔ وہاں اس فہرست میں اسلام کو داخل کرنے سے تامل کیا۔ حالانکہ اسلام ہی مذہب محبّت مکمل طور پر دنیا میں لایا۔ ان لوگوں کے دلوں میں شاید

اُن جنگوں کا خیال ہو گا جن کی اجازت اسلام دیتا ہے۔ لیکن موجودہ جنگ نے تو اُس ہذیان کا اب منہ بند کر دیا جو اسلام کے خلاف عیسائی مشنری پراپیگنڈا اس امر میں کیا کرتا تھا۔ یہ لوگ جب ازراہِ تعصب حق جوئی اور حق بینی سے بہت دور چلے گئے۔ تو خدا تعالیٰ نے یہ جنگ عظیم[۱] پیدا کر کے اِن پادریوں کے ہاتھ سے سب ان کے مفروضہ معتقدات خاک میں ملا دئیے۔ جون ۱۹۱۷ء کو لندن کا منظر میری نگاہوں نے نہایت دلچسپی سے دیکھا۔ جب لندن کا بشپ پادریوں کی ایک جماعت کو گلے میں صلیب لٹکائے ہوئے لندن کے بازاروں سے پھرتا ہوا ہائیڈ پارک میں لے گیا۔ وہاں اُس نے تقریر بھی کی اس تقریر کا خلاصہ یہ تھا۔ کہ اس جنگ میں شریک ہونا اور اپنے ملک کو حملہ سے بچانا ہی مذہب ہے پھر اُس نے نہایت ہی کمزور طریق پر مسیحؑ کے خطبہ کوہی کی اُن آیات کی کچھ توضیح بھی کی۔ جو شمولیت جنگ سے روکتی تھی۔ الغرض اس جنگ نے جس میں بہت سے پادری بطور سپاہی شریک ہوئے اور لڑے ثابت کر دکھایا کہ بعض جنگیں نسل انسانی کے امن کے لئے ضروری ہیں۔ اور سچی محبت انسانی اسی میں ہے۔ کہ ظالموں کے ہاتھ سے بذریعہ جنگ خلق خدا کو بچایا جائے۔

امن عامہ کے لئے جنگ ایسی ہی ضروری ہے۔ جیسے امن و آشتی کے رستے۔ اسلامی جنگوں کے متعلق میں یہاں کوئی لمبی چوڑی بحث کرنا نہیں

[۱] جنگ عظیم اوّل

چاہتا۔ نہایت مختصر الفاظ میں قرآن کریم کی تعلیم اس امر کے متعلق یہاں دے دیتا ہوں۔ جو غلط فہمیوں کے دور کرنے کے لئے کافی ہے۔

قرآن کریم نے صرف تین ہی موقعوں کے لئے جنگ کی اجازت دی ہے۔ دو امور تو مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور تیسرے کا تعلق حفاظت خود اختیاری سے ہے۔ مذہب کی خاطر جنگ کرنا نہ تو اشاعت مذہب کے لئے ہی جائز ہے نہ کسی کو زبردستی مذہب میں داخل کرنے کے لئے۔ بلکہ حفاظت مذہب کیلئے اولاً جب کسی مذہب کی عبادت گاہ خطرے میں ہو۔ اور اس مذہب کے مخالف یا کوئی اور اُسے مسمار کرنا چاہیں تو ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اُس عبادتگاہ کے بچانے کے لئے خواہ وہ عبادتگاہ کسی مذہب سے تعلق رکھتی ہو جنگ کرے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ
صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا
اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ط (الحج ۴۰)

(ترجمہ) اگر خدا تعالیٰ بعض لوگوں (کی شرارت) کا دفعیہ دوسروں کے ذریعے نہ کرتا تو خانقاہیں۔ گرجے۔ یہودیوں کی عبادت گاہیں۔ اور مسجدیں گرائی جاتیں جن میں خدا کا نام لیا جاتا ہے۔

کس فراخ دلی سے ہر مذہب کی عبادت گاہ کی حفاظت قرآن نے مسلمانوں کے ذمہ ڈال دی ہے۔ رواداری کی بھی کوئی حد ہے کہ ان سب عبادت گاہوں میں

مسجد کا نام سب سے آخیر لیا۔ اور سب سے پہلے دنیا جہاں کی ایسی جگہوں کا نام لیا ہے جہاں اُن مذاہب کے معلم رہیں۔ اور اپنے اپنے طریق پر خدا کی عبادت کریں آج کوئی ہندوستان کا نقشہ ہی دیکھ لے۔ یہاں ایک ہزار برس تک تو مسلمانوں کی مضبوط سلطنت رہی ہے اور کل کا کل ملک قدیمی مندروں۔ شیوالوں اور ٹھاکر دواروں سے آج بھی معمور نظر آئے۔ ان عبادت گاہوں میں بُت ہی ہزاروں برس سے پوجے جاتے تھے۔ یہ عمارتیں بھی قدیمی ہیں۔ مسلمان بت شکن بھی مشہور ہیں لیکن اس قرآن کی آیت کو وہ کیا کرتے۔ وہ تو ان عبادتگاہوں کو مسمار ہونے سے بچانے کی ہدایت دیتی ہیں۔ اس لئے یہ سب مندر محفوظ رہے۔ بالمقابل سپین۔ مالٹا اور جنوبی فرانس کو دیکھو مسلمانوں کی مساجد۔ زیارت گاہیں۔ مقابر۔ کتب خانے اور مذہبی مدرسے کیا ہوئے؟ مسیحی ظلم و تعدی نے انہیں خاک میں ملا دیا۔ اب بتلاؤ کہ مذہب محبت عملاً کون ثابت ہوا۔ اسلام یا عیسائیت؟

دوسرا موقعہ جس پر ایک مسلمان نے تلوار اُٹھانی ہے۔ وہ اس لئے کہ ہر ایک انسان کو مذہبی آزادی حاصل ہو۔ انسان اور خدا میں معاملہ مذہب قائم رہے کوئی تیسرا شخص مذہبی امور میں انسان اور اُس کے خدا کے درمیان حائل نہ ہو۔ جس کا جو جی چاہے۔ مذہبی عقائد رکھے۔ لیکن جب اس قسم کے مذہبی متعصب دنیا میں پیدا ہو جائیں۔ جو اپنے ظلم اور تعدی سے نہ ہندو کو ہندو رہنے دیں۔ اور نہ عیسائی کو عیسائی۔ اور نہ مسلمان کو مسلمان۔ تو اُس وقت مسلمان کا فرض ہے کہ ایسے ظالموں

ے خلاف جنگ کرے اور زمین پر وہ حالت امن پیدا کردے کہ ہر ایک انسان مذہبی معاملات میں اپنی رائے کا مالک ہو۔ اوّل تو قرآن نے یہ ہدایت کی۔ کہ لا اکراہ فی الدین یعنی مذہبی معاملات میں کوئی جبر و اکراہ نہ کرو۔ جو کسی کی خوشی ہو وہ مذہب رکھے۔ دین تو کسی نے خدا کا قبول کرنا ہے اور اس میں اُسے آزادی کامل چاہیئے۔ لیکن جب کوئی شخص اپنا مذہب دوسرے سے بہ سختی قبول کراتا ہے۔ خواہ وہ مذہب حقہ ہی کیوں نہ ہو تو وہ خدا کا مذہب نہیں۔ بلکہ اپنا مذہب منواتا ہے۔ ایسے شخص کے ہر فتنہ کو روکنے کے لئے فرمایا۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّيْنُ
لِلّٰهِ ۖ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝

(ترجمہ) ایسے لوگوں سے لڑو۔ جب تک کہ فتنہ نہ مٹ جائے اور دین خدا کے لئے رہ جائے لیکن اگر وہ باز آجائیں۔ تو پھر اُن سے جنگ نہ چاہیئے۔ الّا اگر وہ ظلم پر اڑے رہیں (البقرہ۔ ۱۹۳)

تیسرا موقعہ جنگ کا حفاظت خود اختیاری ہے اس میں ذیل کے احکام ہیں۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا
تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَاقْتُلُوْهُمْ
حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ
وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ
عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ

قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَاِنِ
انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (البقرہ ۱۹۰، ۱۹۲)
اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى
نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۝ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ
بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ (الحج ۳۹/۴۰)

(ترجمہ) خدا کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو ۔ جو تم سے لڑیں ۔ لیکن حدود سے نہ بڑھو ۔ اللہ تعالیٰ حدود سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا ۔ اور اگر وہ جنگ چھوڑ دیں تم بھی جنگ چھوڑ دو ۔ (سب سے پہلی آیت جس نے جنگ کی اجازت دی وہ یہ ہے) ان کو جنگ کی اجازت دی جاتی ہے جن سے جنگ کی گئی ۔ کیونکہ وہ مظلوم ہیں ۔ اور اللہ تعالیٰ اُن کی مدد کرنے پر قادر ہے ۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو گھروں سے نکالا گیا ۔ اس کی کوئی وجہ حقہ نہ تھی ۔ ان کا قصور تھا کہ وہ اللہ کو پروردگار سمجھتے تھے ۔

ان آیات کی عملی تفسیر حضرت نبی کریم صلعم کے غزوات سے ہوتی ہے مجھے نہ ان جنگوں کی یہاں تشریح کی ضرورت ہے نہ اُن اسباب کے بتلانے کی حاجت ہے جن سے یہ جنگ پیدا ہوئے ۔ دو لفظ میں یہ معاملہ طے ہو جاتا ہے ۔ کہ آیا یہ جنگ اس حکم بالا کے ماتحت تھے یا مذہب کے پھیلانے کی غرض سے ؟ ان غزوات میں سے نمایاں صرف تین جنگ ہیں ۔ جن کے بعد عرب میں صورت حرب پیدا ہو گئی باقی کل کے کل جنگ اسی قسم کے تھے جو صورت حرب سے تعلق رکھا کرتے ہیں ۔ پہلے

تین جنگ **بدر۔ اُحد** اور **جنگ احزاب** کے نام سے مشہور ہیں۔ اِن تینوں جنگوں کے مقام کی تعیین کرلو۔ اور خود فیصلہ کرلو۔ کہ آنحضرت صلعم اپنی جان بچانے کے لئے گھر سے نِکلے۔ یا کسی اور غرض سے ؟ آنحضرتؐ نے حفاظت جان کے لئے ایسے وقت میں جب کفار کی طرف سے اذیت کی کوئی حد نہ رہی۔ مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی آپ تو مدینہ چلے آئے لیکن دشمن آپؐ کو اور آپؐ کے مشن کو خاک میں ملانے کے سوا کیا بازرہ سکتا تھا۔ دشمن مکہ میں ہے اور آپؐ مدینہ میں۔ مکہ اور مدینہ میں ایکسو پچاس[۱۵۰] میل کا فاصلہ ہے۔ پہلے جنگ کا مقام بدر ہے جو مکہ معظمہ سے ایک سو بیس[۱۲۰] میل اور مدینہ سے تیس[۳۰] میل پر ہے۔ دوسرے جنگ کا مقام اُحد ہے جو مکہ مکرمہ سے ایک سو اڑتیس[۱۳۸] میل اور مدینہ سے بارہ میل کے فاصلہ پر ہے تیسرے جنگ **احزاب** میں عرب کی کل قومیں مدینہ پر چڑھ آئیں اور آنحضرت صلعم محسور ہو گئے۔ یہ تین جنگ ہیں اب خود فیصلہ کرلو۔ کہ لڑنے کو کون آیا۔ اور جان بچانے کے لئے گھر سے کون نکلا ؟ اس جنگ کے بعد ایک حربی کیفیت ملک میں پیدا ہو گئی اور کبھی اس طرف سے اور کبھی اُس طرف سے چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہیں اِن جنگوں کا خاتمہ **فتح مکہ** نے کیا۔ آنحضرت صلعم گھر سے حج کے لئے دس ہزار صحابہؓ کے ساتھ نِکلے اور مکہ سے باہر ڈیرے ڈال دئے۔ دنیا کی تاریخ میں فتح مکہ ہی ایک ایسا واقعہ ہے کہ جس میں ایک قطرہ خون بھی نہ گرایا گیا۔ دشمن مغلوب ہو گئے۔ یہ دشمن وہی تھے جنہوں نے آنحضرت صلعم اور اُن کے رفقاء کو ہر طرح کی تکلیف دی اور

اسلام کے مٹانے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ لیکن جب وہ سامنے آئے۔ تو سب کو معاف کردیا۔ مسیحؑ نے یہ تو کہہ دیا۔ کہ" اپنے دشمنوں سے محبت کرو"۔ لیکن تاریخ عالم میں اگر اپنے دشمن سے کسی نے محبت کی۔ تو اس کا عملی نمونہ فتح مکہ میں ہی پاؤ گے کسی کا صلیب پر کھڑے ہو کر اپنے ظالموں کو معاف کر دینا کوئی عمدہ مثال دشمنوں سے محبت کی نہیں۔ دشمن اور ظالم کو معاف کرنا اُس وقت ہو سکتا ہے جب یہ تین صورتیں پیدا ہوں۔

اوّل۔ ایک شخص پر ظلم ہو۔ دوئم مظلوم دشمن پر غالب آئے اور انتقام لینے کی قدرت رکھتا ہو۔ سوئم۔ انتقام کی بجائے معاف کر دے جب تک یہ باتیں موجود نہ ہوں مظلوم اور مقہور حالت میں کسی کو معاف کر دینا محض دل کو خوش کرنا ہے البتہ نیک دلی کا اظہار ضرور ہے بات تو تب ہے کہ ع

"گر بہ طاقت برسی مست نگردی مردی"[۱]

یہی وہ مذہب محبت ہے جو اسلام لایا۔ مذہب محبت چند نرم اور آشتی کے فقروں سے نہیں بنا کرتا۔ مذہب محبت میں مخلوق الٰہی کے نفع کو سامنے رکھنا ہے۔ اور اس نفع کی حفاظت میں اگر ایسے لوگوں کی تادیب۔ اصلاح اور اُن کے ضرر کو روکنے کے لئے کچھ سختی بھی برتنی پڑے۔ جو مخلوق الٰہی کے مفاد کے دشمن ہوں۔ تو وہ سختی نہیں۔ وہ بھی محبت ہے۔

قرآن کریم نے اُن موانع کا بھی لحاظ کر لیا ہے جو انسانی شفقت و رحمت کو کسی

---

[۱] اگر تمہیں کبھی طاقت نصیب ہو جائے تو تمہیں مغرور نہیں ہو جانا چاہئے۔

دوسرے کی طرف نہیں جانے دیتے آج مشرق مغرب کے جھگڑے نے کس قدر مصیبت ڈال رکھی ہے بعض مشرقی قومیں بالخصوص مغربی نگاہ میں حیوانوں سے بدتر ہیں ادنیٰ قوموں کو تو چھوڑ دو۔ کل کی کل مشرقی قومیں اہل مغرب کی نگاہ میں درجۂ انسانیت میں بھی اُن کے ہمسر نہیں۔ ایک کُتّا جن مراعات کا مغرب میں مستحق سمجھا گیا ہے۔ اُس کے عشر عشیر سے بھی بعض انسان محروم رکھے جاتے ہیں۔ جاپان کی موجودہ تباہی پر ریورنڈ بی۔ ٹی ولڈن ہارٹ گرجے میں دعا کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے کہ زلازل جاپان ایسے وقت واقع ہوئے جب اکثر یورپین لوگ وہاں سے نکل چکے تھے جس مذہب نے اس احساس وادراک کے معلمانِ مذہب پیدا کئے ہیں اس کو مذہب محبت کہنا عجب بوالعجبی ہے۔ اسی مشرق و مغرب کے سوال کو سامنے رکھ کر قرآن مجید نے جس خدا کی عبادت کرائی۔ اس کا نام نہ صرف رب العالمین ہی فرمایا۔ بلکہ اس کو رب المشرق والمغرب بھی کہا۔ اسلام میں عبادت کی بہترین شکل مخلوق کی ہمدردی ہے

أَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۝ فَذَٰلِكَ الَّذِي
يَدُعُّ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝ فَوَيْلٌ
لِّلْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝
الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ۝ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ۝

(ترجمہ) کیا تُو نے اُس شخص کی حالت پر غور کیا جو دین کو جھٹلاتا ہے۔ یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔ پس نمازیوں پر افسوس ہے جو اپنی نماز سے غافل ہیں جو دکھاوا کرتے ہیں اور خیرات کو روکتے ہیں۔ (الماعون ۱ : ۷)

اس سورۃ میں گویا دین کے معانی ہی تیمیوں سے نیک سلوک اور غرباء کی پرورش ہے۔ ایسا ہی اس شخص کی عبادت کی بھی کوئی عزت خدا کی نگاہ میں ظاہر نہیں کی گئی جو خیرات و حسنات نہیں کرتا اور اگر کرتا ہے تو دکھانے کیلئے کرتا ہے الغرض ربّ قرآن کریم کا وہ پرستار ہی نہیں جو اپنی ہمدردی میں مشرق و مغرب کا لحاظ کرتا ہے۔

دنیا میں مختلف مذاہب کا تعلق بھی اہل مذہب کو ایک دوسرے کیساتھ ہمدردی کرنے سے روک دیتا ہے۔ بعض لوگ دوسرے مذاہب والے پر ضلالت و گمراہی کا ہی فتویٰ نہیں دیتے۔ بلکہ بعض وقت اس کو اپنی ہمدردی کا بھی مستحق نہیں سمجھتے کسی شخص کا دوسرے مذہب سے تعلق رکھنا اُن کی مراعات سے اسکو خارج کر دیتا ہے۔ اس نقص کو سامنے رکھکر قرآن نے ہر مذہب کو دراصل سرچشمہ الٰہی سے نکلا ہوا ہی قرار دیا اور اُن کے رہنماؤں کو خدا کے نبی اور مرسل قرار دیا ہے اور ان کی تعلیمات کو اپنے اصلی رنگ میں واجب الاتباع ٹھہرایا۔ کاش دنیا اس اصول اسلام پر عمل کرتی تو اہل مذاہب کا باہمی فساد نصف سے زیادہ ختم ہو جاتا۔ کیا یہ ممکن ہے۔ کہ میں کسی مذہب کے بزرگ کی دل سے عزت کروں۔ اور میرا یہ عمل اس کے پیرو کے دل میں میرے لئے عزت اور محبت پیدا نہ کر دے مذہبی اور قومی تخالف علی العموم انسان کو عدل کی راہوں سے بہت دُور پھینک دیتا ہے لیکن قرآن کریم نے اس بات کا بھی ازالہ کر دیا ہے جیسے کہ فرمایا۔ لا یجرمنکم شنان قوم ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ یعنی قومی تخالف تمہیں ایسا نہ کر دے کہ تم عدل کو چھوڑ دو۔ تمہیں عدل ہی کرنا ہے یہ پرہیزگاری کے بہت ہی قریب ہے اگر دنیا اس ایک

حکم کی پابندی کرلے تو مذہب محبت کی وہ پختہ بنیاد قائم ہو سکتی ہے جس سے آئندہ کی تعمیر آسان سے آسان ہو جاتی ہے میں اوپر دکھا چکا ہوں کہ ارتقائے ادراک میں پہلی منزل **ادراک ذاتی** ہے یعنی انسان اپنے حقوق اوروں سے لے اور دوسروں کے حقوق ان کو دے دے گویا ادراک ذاتی کی تکمیل کے لئے **عدل** ازبس ضروری ہے کل دنیا پر نظر ڈال کر دیکھ لو کتنے ہیں جن میں یہ ادراک ذاتی کامل طور سے نشو و نما پا چکا ہے ہزاروں چھوڑ لاکھوں میں ایک انسان بھی اس خوبی کا نظر نہیں آتا۔ یہ اہل مغرب جو عیسویت کی روایات اور کلیسیا کے معتقدات سے بیزار ہو کر مذہب محبت کی تلاش میں لگ گئے ہیں وہ سب سے پہلے اپنے بھائی بندوں کو خلق **عدل** کی تعلیم دیں کیا زنگ۔ مذہب اور قوم کی تمیز اہل مغرب کو دیوانہ نہیں بنائے رکھتی۔ عدل کی طرف تو تب متوجہ ہوں جب کسی کو اور اپنے برابر سمجھیں دوسرے تو ان کی نگاہ میں انسان ہی نہیں۔ پھر عدل کیسا۔ یہ مذہب محبت کے متلاشی بزرگ اپنے مصالح کے مقید ہو کر علی الاعلان اسلام قبول کریں یا نہ کریں۔ لیکن مذہب محبت کے اصول حقہ کی اگر ان کو ضرورت ہو تو اُنہیں قرآن حمید کے ہی آگے سر جھکانا پڑے گا ؎۔

وما علینا الا البلاغ۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

نویسندہ ملک عبدالحمید ۲۲۔میسن روڈ۔ لاھور

نوائے وقت پرنٹرز لمیٹڈ، لاھور